حضرت نانی اماں بھی اس طوفان میں گھر گئی تھیں جن کو لیکر میری اہلیہ والدہ عزیز عبد القادر راہ بھول گئیں۔ اور کھیتوں میں نکل گئیں۔ اور جب اجالا ہؤا۔ تو مولوی غلام رسول صاحب افغان والے مکان کے راستہ سے ڈھاب اور کھیتوں میں ہوتے ہوئے گھر لائیں۔ گھر لا کر اُن کو کپڑے بدلوائے بستر وغیرہ گرم کیا۔ اور جو کچھ ہو سکا خدمت کی۔ ادھر گھر میں اُن کی تلاش شروع ہوئی۔ باہر نہ ملیں۔ تو گھروں سے معلوم کرنا شروع کیا۔ آخر معلوم ہؤا۔ کہ قادیانی کے گھر میں بخریت ہیں۔ مگر یہ واقعہ بہت بعد کا ہے۔

یکہ بان گھبرا رہا تھا۔ اور گھوڑے کے چارہ دانہ اور مقام ٹھکانہ کے مدنظر جلدی چلنے کا تقاضا کرتا تھا۔ "اندھیرا ہو جائیگا۔ تو راہ چلنا دشوار ہوگا۔ رات ہو جائیگی تو چارہ دانہ بھی نہ ملے گا۔ اور گھوڑا منزل مارنے کے بعد بھوکا مریگا۔" وہ ایسی ہی باتیں بار بار دہراتا تھا۔ دوسری طرف والد محترم بھی اپنے بعض خاص خیالات کی وجہ سے اس کی پُرزور تائید فرما رہے تھے۔ کیونکہ ان کی مصلحتوں کا بھی یہی تقاضا تھا۔ کہ جسقدر جلد قادیان کی حدود سے مجھے باہر لے جائیں۔ اتنا ہی اُن کو اپنی کامیابی اور حصولِ مقصد کے لئے ضروری معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ بھی مجھے جلدی چلنے کو بار بار فرماتے تھے۔ اگرچہ لب ولہجہ ان کا نہائت پر حکمت اور تلطف آمیز تھا۔ مگر ان کے دل کی گہرائیوں میں جو خیالات موجزن تھے۔ اور جس کشمکش اور گھمسان کا تلاطم ان کے دماغ میں اسوقت پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اتنا زور دار تھا۔ کہ اس کا انعکاس میرے دل و دماغ کو بھی ضرور متأثر کر رہا تھا۔ اور میرا دل و دماغ بھی ان باتوں کو محسوس کر رہا تھا۔ اور آنے والا خطرہ اپنی بھیانک شکل میں متمثل ہو کر میرے سامنے کھڑا ہو کر میری راہ روک رہا تھا۔ اور تعجب نہیں کہ میرے محسن بزرگ اور دوست جو نہائت محبت سے مجھے الوداع کہنے کو آئے ہوئے تھے۔ اسی اثر سے متأثر ہو کر غیر معمولی محبت اور ہمدردی کا اظہار فرما رہے تھے اور بار بار کبھی مجھ سے اور کبھی میرے والد بزرگوار سے جلد آجانے یا جلد بھیجدینے اور شفقت و مہربانی کے سلوک کی تاکید کرتے تھے۔ جس کے جواب میں میری چشم پُرنم اور والد محترم کے حکیمانہ وعدے اور تسلی آمیز فقرات اُن کے خطرہ کے احساس کو اور بھی تیز کر رہے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ یہ بے موقعہ صحبت بھی بہت لمبی ہوئی جاتی تھی۔ میرا دل بلیّوں اچھل رہا تھا۔ اور خیالات میں ایک قسم کا تلاطم بپا تھا۔ دل میں بار بار جوش اٹھتا۔ کہ اب بھی ہمت کر کے بھاگ کھڑا ہو۔ تجھے کوئی پکڑ تو سکے گا نہیں۔ چار دن اِدھر اُدھر گزار لے پھر سے اپنی گلی کوچوں میں آجانا والد محترم آخر ملازم سرکار ہیں۔ کب تک پیچھا کریں گے۔ مگر ایسے خیالات کے ساتھ ہی محسن و محبوب آقا کے فرمان کی یاد بیچ میں آکر ایک سدِ سکندری کھڑی کر دیتی تھی۔ جس کے حسن و احسان نے مجھکو نہ نظر آنے والے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ اور جس کی شفقت و مروت نے مجھے ایسا گرویدہ کر لیا تھا۔ کہ اُس سے دُوری موت نظر آتی تھی۔ جس کی نگاہ ناز مردہ روح میں زندگی پیدا کر دیتی تھی اور جس کی چشم نیم وا اندھوں کو بینائی بخشتی تھی جس کا جذب اس کے آستانہ پر گرنے والوں کو اُسی کا بنا دیتا تھا۔ اور جس کی صحبت دنیا جہان کی صحبتوں کو بدمزہ اور بے لطف بنا دیتی تھی جس کا کلام روح پرور اور جس کی ہر ادا زندگی بخش تھی۔ اس کا حکم اور سچ مچ اسی کا فرمان تھا۔ کہ جسے میں نہ صرف یہ کہ توڑ نہ سکتا تھا۔ بلکہ اس تلخ پیالہ، اِس زہر آلودہ پیالہ کے پی جانے پر آمادہ و کمربستہ کر رہا تھا۔ مجھے آنے والے خطرہ کا احساس تھا۔ اور قادیان سے جانا مجھے موت کے مونہہ میں جانا معلوم دیتا تھا۔ مگر حضورؓ پر نور کے ارشاد کی تعمیل میں اس موت کا قبول کرنا میرے لئے آسان ہو جاتا تھا۔ اور میں اپنے خیالات کو دل سے نکال کر جی کو کڑا کر کے بھاگ کھڑا ہونے کے وہم کو دھتکار دیتا تھا۔

اِسی کشمکش اور خیالات کی جنگ کے دوران میں اللہ اکبر۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اللہ اکبر کی پرہیبت مگر سُریلی صدا اٹھی اور اُس نے اُس جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ حق کی فتح ہو گئی۔ اور شیطانی لشکر مغلوب ہو گیا۔ میرا دل خدا نے مضبوط کیا مجھے تسلی دی۔ اور اطمینان بخشا۔ شیطانی وساوس پاش پاش ہوئے۔ اور میں اپنے آقا و امام کے حکم کی تعمیل میں اپنے والد صاحب کے ساتھ ہو لیا۔ دوستوں نے پھر سے ایک مرتبہ میرے والد صاحب سے میرے جلد واپس بھیجدینے کی سفارش کی جس کے جواب میں والد صاحب نے آخری فقرہ یہ کہا۔ کہ "یہ اپنے پالے ہوئے مرغ ختم کر کے واپس آجائیگا۔"

میں یکہ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ اور الٹا بیٹھا۔ تاکہ نظر قادیان کی طرف رہے۔ یکہ جلد جلد چلنے لگا۔ نہ معلوم والد صاحب کو کیا خیال آیا مجھے پچھلی سیٹ سے آگے بٹھا کر خود میری جگہ بیٹھ گئے۔ اور یکہ بان کو جلد چلانے کا حکم دیا۔ سڑک کا موڑ آیا۔ نہر آئی۔ وڈالہ بھی نکل گیا۔ مگر یکہ نہ ٹھہرا۔ آخر دیوانی وال کا تکیہ آگیا۔ والد صاحب نہ چاہتے تھے۔ کہ یکہ ٹھہرے۔ مگر گھوڑا تکان محسوس کرنے لگا۔ اور عصر کی نماز کا وقت بھی تنگ ہونے کو آیا تھا۔ گھوڑا کچھ تو تھکان کے باعث، کچھ عادتاً رُک گیا۔ میں نے غنیمت جان کر چھلانگ لگا دی۔ نیچے اُترا اور تکیہ کے کنوئیں سے پانی لیکر وضو کیا۔ اور نماز عصر کیلئے اپنے رب کے حضور کھڑا ہو گیا۔ نماز گذاری۔ اللہ کے حضور عرض حال کیا۔ پیش آمدہ حالات کے مدنظر دعائیں مانگیں۔ اور فارغ ہو کر اٹھا ہی تھا۔ کہ پھر وہی "جلدی" کرنیکا حکم ملا۔ تعمیلِ ارشاد کی اور یکہ بان گھوڑے کو تیزی سے ہانکنے لگا۔ شام قریب تھی گھوڑا کمزور پھر تھا۔ ابھی ساڑھے تین میل باقی تھے۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ اور بٹالہ پہنچتے پہنچتے خاصہ اندھیرا چھا گیا تھا۔

بٹالہ پہنچکر والد صاحب نے یہی مناسب سمجھا۔ کہ کسی علیحدہ جگہ رات گذاریں۔ لہذا بٹالہ منڈی کی قدیم سرائے جو اندنوں (۲۹-۱۹۳۵ء) میونسپل کمیٹی کا دفتر ہے۔ اور تحصیل کی عمارت کے جانب جنوب بٹالہ قادیان کی سڑک کے جنوبی کنارے پر واقعہ ہے۔ اور جس کے چاروں کونوں پر چار گول برج اور بڑا شاندار بلند و بالا دروازہ شمالی جانب بنا ہؤا ہے۔ اور اُس عمارت کے جنوب میں ایک وسیع تالاب واقعہ ہے۔ جو آجکل (۲۹-۱۹۳۵ء) پانی سے خالی اور خشک ہے۔ پہلے زمانہ میں عموماً بھرا رہتا تھا۔ قیام پذیر ہوئے۔ یہ جگہ اس زمانہ میں سرائے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

والد صاحب نے پہلے تو یکّہ بان کو گھوڑے کے چارہ دانہ کا انتظام کرنے کو بھیجا۔ اور جب وہ فارغ ہو کر آگیا۔ تو اُس کو میرے پاس ٹھہرا کر خود کھانے وغیرہ کے انتظام کو تشریف لے گئے۔ والد صاحب نے اسی یکّہ بان کے ساتھ آگے چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور چونکہ اس سے کچھ تعارف ہو چکا تھا۔ کچھ طمع دے کر اپنے مطلب کا بنا لیا۔ وہ گو مسلمان تھا۔ مگر اتنا غریب تھا۔ کہ چند پیسے کے طمع پر سبھی کچھ کرنے کو حاضر تھا۔ اس وقفہ میں مَیں نے نمازِ شام اور عشاء ادا کی۔ اور والد صاحب کی واپسی تک اس فرض سے فارغ ہؤا۔ والد صاحب کھانا لائے۔ خود دکان پر ہی فارغ ہو آئے تھے۔ مجھے کھلایا۔ اور کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ سو رہے۔ رات کا پچھلا پہرہ تھا۔ کہ عادتاً میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں اپنی چارپائی پر ہی بیٹھا ذکر میں مشغول ہؤا۔ آہٹ پا کر والد صاحب بھی چونک پڑے اور گھبرا کر مجھے پکارا۔ مگر میری آواز سنکر مطمئن ہو گئے۔ ہوش سنبھالے اور وقت کا اندازہ کر کے یکہ بان کو تیاری کا حکم دیا۔

میں نہ سمجھا کہ والد صاحب کس خیال میں ہیں۔ اور کیوں یکّہ بان کو تیاری کا حکم دیا ہے۔ جبکہ بٹالہ سے گاڑی ملتی ہے۔ تو کیوں گاڑی چھوڑ کر یکّہ کو پسند کیا جا رہا ہے۔ مگر مصلحتاً میں بھی خاموش رہا۔ اور قدرت کے کھیل کو دیدہ حسرت سے دیکھا کیا۔ جب یکّہ بان تیار ہو گیا پھر روانگی کا حکم ملا۔ سوار ہو کر کسی نامعلوم جانب کو روانہ ہوئے۔ چونکہ ابھی رات کا اندھیرا تھا۔ اور میں ان راستوں سے بھی نا آشنا تھا۔ لہذا باوجود کوشش کے نہ سمجھ سکا۔ کہ کدھر جا رہے ہیں۔ آخر چند میل کا سفر طے کرنے کے بعد شرق میں صبح کی سفیدی نمودار ہوئی۔ اور اوجالا ہونے لگا۔ مجھے صبح کی نماز کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور جوں جوں اجالا بڑھتا گیا۔ میری گھبراہٹ میں اضافہ ہونے لگا۔ اور لب سڑک ایک چلتا کنوآں دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور والد محترم کی خدمت میں یکّہ کو ٹھہرانے کی درخواست کر ہی دی۔ جو منظور کر لی گئی۔ یکّہ روک لیا گیا۔ میں خوشی سے اُترا۔ جلد جلد وضو کیا اور صبح کی نماز اسی کنوئیں کے پاس ادا کر کے شکر خداوندعلم ادا کیا۔

اَب اچھا اُجالا ہو چکا تھا۔ سڑک کنارے لگے ہوئے میلوں کے نشانات سے معلوم ہوا۔ کہ جس سڑک پر ہم لوگ سفر کر رہے ہیں۔ ڈیرہ بابا نانک کو جاتی ہے۔ اور اس سے میں نے اندازہ یہ کیا۔ کہ والد صاحب قبلہ نے احتیاطاً سیدھا راستہ چھوڑ کر چکر لگایا ہے۔ اور میں نے یہی نتیجہ نکالا۔ کہ والد صاحب محترم کو ابھی تک یہ خطرہ باقی تھا۔ کہ مبادا کوئی تعاقب کر کے مجھے اُن کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کرے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے امرتسر کا راستہ اور ریل کی سواری چھوڑ دی تھی۔ اور کہ اب وہ مجھے ڈیرہ بابا نانک سے سیالکوٹ اور وہاں سے وزیرآباد لے جائیں گے۔ جہاں سے انہی دنوں میں ریلوے لائین موجودہ لائل پور کی طرف نکل رہی تھی۔ اور چھکڑے وغیرہ سانگلاہل تک چلنے لگے تھے۔

چلتے چلتے ڈیرہ بابا نانک آیا۔ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو کے یکہ ٹھہرایا گیا۔ گھوڑے کی مالش چاپی ہوئی۔ نہاری وغیرہ دیکر اُسے تازہ دم کیا گیا۔ اور خود ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر آگے کو روانہ ہوئے۔ راستہ میں دریائے راوی پڑتا تھا۔ پتن اور بیڑی کا راستہ تھا۔ اور چونکہ یہ علاقہ ہمارا وطن تھا۔ لہذا کچھ زیادہ احتیاط اختیار کی جانے لگی اور وضع قطع میں تغیر کے علاوہ راستہ کتر کتر کر چلنے کی کوشش کی گئی۔ تاکہ کنجروڑ وغیرہ اپنے دیہات کیطرف سے آنے والے واقف کاروں کے سوال و جواب سے بچاؤ ہو سکے۔ دریا پر پہنچکر ایسی کوشش کی گئی۔ کہ دریا سے اس پار کی سواریاں لانے والی کشتی سے پہلے ہی پہلے دوسری ناؤ میں بیٹھ کر نکل جائیں۔ چنانچہ ایسا ہوا۔ کہ اُدھر سے آنے والی کشتی اِدھر کو آ رہی تھی۔ اور ہماری ناؤ اُدھر کو جا رہی تھی۔ اور اس طرح کسی واقف کار سے سامنا ہوا نہ کسی نے جانا پہچانا۔ اور ہم لوگ دوسرے کنارے جا لگے۔ ہمارے دیہات سے آنے والے لوگ عموماً پہلی ناؤ سے آیا کرتے۔ اور آخری کشتی سے واپس چلے جایا کرتے تھے۔ اور اُن دنوں میں ہمارے اُس علاقہ کا تجارتی مرکز ڈیرہ بابا نانک تھا۔

دریا پار ہو کر پھر یکہ جلد جلد چلنے لگا۔ اور دس بجے کے قریب ہم لوگ دیرم دتّاں کے برابر تھے۔ جہاں کے ایک شریف زمیندار دت گھرانے کی دامادی کی مجھے عزت تھی۔ اور طبعاً ان تعلقات کے مدّنظر میرے جذبات میں ایک قسم کا تموّج تھا۔ اور میں خونی رشتہ کی وجہ سے خون میں ایک غیر معمولی حرکت پاتا تھا۔ مگر ہاں میرا خیال یہی تھا۔ کہ والد صاحب بزرگوار بحالتِ موجودہ اس بستی کا رُخ نہ کریں گے۔ بلکہ باہر ہی باہر سیدھے کنجروڑ دتاں کو جائیں گے۔ جہاں ہمارے مکانات اور رشتہ ددھیال تھا۔ اور جو دیرم سے کم وبیش دو میل کے فاصلہ پر بسنتر ندی کے کنارے بہت ہی بلند و بالا اونچی اور شاندار عمارات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اور ہماری برادری کی شاندار روایات اور اُن کے عروج و اقبال کی یاد تازہ کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اور جس کے سرسبز اور خوبصورت باغات قصبہ کی رونق کو دوبالا کر رہے تھے۔

مگر میری امید اور خیال کے بالکل برعکس والد صاحب محترم نے یکہ کا رُخ دیرم میرے سسرال کی طرف پھیرا دیا۔ اور گاؤں کے ایک چوگان میں پہنچکر ڈیرے ڈالدیئے۔ وہاں پہنچکر مجھے بڑی شفقت اور نرمی سے فرمایا۔ کہ یہاں تمہارے سسرال ہیں۔ اور ہماری برادری ہے۔ نماز پڑھنی ہو تو کہیں تنہائی میں جاکر پڑھ لینا۔ اور اپنے اسلام کی کسی کو خبر نہ ہونے دینا۔ ورنہ ہماری بے حد ذلت ہوگی۔ اور ہم جہاں برادری میں مونہہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ وہاں جس مقصد کو لے کر آئے ہیں وہ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ تمہاری بیاہتا کو میں ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔

خطرات اگرچہ میرے دل میں پہلے ہی موجود تھے۔ اور میرا دل آنیوالے مشکلات سے بے خبر نہ تھا۔ مگر اس پیغام سے جس میں اگرچہ شفقت کے ساتھ ساتھ نرمی بلکہ لجاجت کا غالب رنگ پایا جاتا تھا میں نے اُن مشکلات کی بو سونگھ لی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور میں نے ایک مرتبہ پھر اس قیدوبند سے نجات پا جانے کی ٹھان لی۔ اور میرے خیالات میں پھر سے ایک خطرناک جنگ چھڑ گئی۔ ایک طرف آنیوالے مشکلات کا خیال تھا۔ تو دوسری طرف ایک زبردست قوت اور نہ مغلوب ہونے والی طاقت تھی جو بہر حال یہ تلقین کرتی تھی۔ کہ بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟ ایسا کرنے سے تم اپنے آقا کے نافرمان کہلاؤ گے۔ قادیان سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤ گے۔ بہتری اِسی میں ہے۔ کہ تعمیل ارشاد کرو۔ اور اس راہ میں آنے والے مشکلات کا مقابلہ کرو۔ تمہارے امام ہمام نے ایک باقاعدہ تحریری معاہدہ لے کر تمہیں والد صاحب کے ساتھ جانے کا حکم دیا ہے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کر کے کس مونہہ سے واپس جاؤ گے اور اپنے آقا کو کیا عذر سناؤ گے وغیرہ۔

انہی خیالات میں لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی۔ نیند کا غلبہ ہو گیا۔ اور ایسا سویا کہ دوپہر بعد جب آنکھ کھلی۔ تو میرے عزیز اور بزرگ میرے سرہانے تھے۔ ملے جلے اور شکوے شکایات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ کھانے کا تقاضا شروع ہونے لگا۔ مگر میں نے طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے ٹال دیا۔ اور گھر تک گیا۔ نہ کھانا کھایا۔ والد صاحب محترم نے بھی اس موقعہ پر میری خوب مدد کی۔ اور عزیزوں کو دوسری طرف متوجہ کر دیا۔ اور ایسی حکمت سے کام کیا۔ کہ میرے سسرال باوجود رسوم کے سخت پابند ہونے اور نام ونمود اور ذات برادری کی قیود کے بہت ہی چھوٹے نوٹس پر اپنی لڑکی کو روانہ کر دینے پر رضامند ہو گئے۔ اور ان کی یہ عمر دنیت میرے لئے سوچنے اور غور کرنے میں غیبی تائید ثابت ہوئی۔ میں ڈیرے سے اٹھا اور گاؤں کے جنوبی جانب ایک گھنی سایہ دار درختوں کی جھنگی میں پہنچا۔ پانی پاس ہی تھا۔ وضو کر کے نمازیں ادا کیں۔ اور خدا سے مدد طلب کی کہ میں اس شکل میں خود کوئی فیصلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ میں نہیں جانتا۔ کہ میرے لئے اِن حالات میں راہِ صواب کیا ہے۔ اپنی رحمت سے میری دستگیری فرما کر راہ نمائی فرمائیں۔ تاکہ میں کسی غلط قدم کی وجہ سے ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں نہ جا پڑوں۔ میرے مولا خود میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی رضاء کی راہ پر قائم کر دیجیئے۔ آمین

دعا کا دروازہ اگرچہ بچپن ہی سے اللہ کریم نے محض اپنے فضل سے میرے لئے کھول رکھا تھا۔ اور مجھے دعاؤں کی عادت تھی۔ اور اسی راہ سے اللہ کریم کی رحمت کے دروازے میرے لئے کھولے گئے تھے۔ اور اسی راہ سے مجھ ناکارہ کو الہ العٰلمین نے کفر وضلالت کے تاریک ترین انتہاہ گڑھے سے نکال کر اس عروج سعادت پر پہنچایا۔ کہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعودؑ مہدی معہودؑ جری اللہ فی حلل الانبیاء کے قدوم میمنت لزوم میں لا ڈالا جس کے لئے صدیوں سے لاکھوں نہیں کروڑوں بزرگ ترستے ہی چلے گئے۔ اور نہ صرف یہی کہ اِس نورِ مجسّم کو دیکھ لینے کی سعادت ملی۔ بلکہ اس سے فیض پانے اور منور ہونے کے لئے اس کی صحبت پاک اور انفاسِ طیّبہ اور توجہات کریمانہ کا مورد بننے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اِن فیوض وبرکات بے انتہا اور لاتعد ولاتحصیٰ میں سے ایک دعا کا خزانہ ہے۔ جو بالکل نئی تجلّی نئے علم اور نئی معرفت، نئی حقیقت اور نئے یقین کے رنگ میں مجھے اس بزرگ و مقدس اور کامل و اکمل انسان کی صحبت سے نصیب ہوا۔ حالت یہ تھی۔ کہ پہلے جسے میں نور یقین کئے ہوئے تھا۔ اب ظلمت محض نظر آتی تھی۔ اور جسے میں زرِ خالص سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ موجودہ معرفت کے مقابل میں ایک کھوٹا پیسہ معلوم دیتا تھا اور وہ چیز جسے میں ایک بے بہا ہیرا سمجھکر پھولا نہ سماتا تھا۔ اب اس نور کے مقابل میں محض ایک پتھر بن کر رہ گیا تھا۔ دعا اور اس کا فلسفہ، دعا اور اس کے لوازم، دعا اور اس کی قبولیت کے شرائط اور گو حضور کی صحبت سے فیض پانے والوں کے دلوں میں حضور کی "صبح کی سیر" اور "شام کے دربار" اور دوسرے اوقات کی صحبتوں سے ایسے نقش ہو جاتے تھے۔ کہ دنیا جہاں کے خزانے اس نعمت پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔

دیرم دتّاں کی سرزمین میں یکہ وتنہا۔ بے یار ومددگار میں مشکلات کی خطرناک تیر بازی کا نشانہ بنا ہوا اپنے لئے کوئی مفر نہ پا کر دستگیری اور راہنمائی کے لئے آستانۂ الوہیت پر گر جاتا ہوں۔ اپنے آقا اور آقا کے آقا کے نام کے واسطے (اوّل و آخر دعا کے درود شریف) سے خدا کی مدد کا طالب ہوتا ہوں۔ کہ اے حی وقیوم خدا! اے بے آسروں کے آسرے اور بے سہاروں کے سہارے تو خود میری مدد کو آ اور غیب سے میرے لئے قدرت نمائی فرما اور مجھے اس راہ پر قائم کر جسے جس میں تیری رضا ہو۔ الخ

میں آستانۂ الوہیت سے سر نہیں اٹھاتا۔ کہ آسمان سے ایک نور اُترتا اور مجھ پر سکینت ڈال جاتا ہے۔ جس سے میرا دل و دماغ منوّر ہو کر مجھے غیر معمولی طاقت و قوت مل جاتی ہے۔ ایسی کہ اِس سے پہاڑ ٹل جائیں اور سمندر ساکن ہو کر رہ جائیں۔ اَب مجھے کوئی خوف باقی رہا تھا۔ نہ خطرہ بلکہ ایک مضبوط چٹان کی طرح قوی عزم اور غالب حزم عطا کر دیا گیا تھا۔ اور ایسی لذت اور سرور محسوس ہونے لگا۔ کہ لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

گو پہلے بھی دعا کیا کرتا۔ اور عموماً قبول ہُوا کرتی تھی۔ مگر احمدیت کے بعد اپنے آقا ئے نامدار کی قوت قدسی سے جو نفخ روح نصیب ہُوا۔ ایک عجیب ہی رنگ رکھتا تھا۔ پہلے کی دعائیں محض رسمی رنگ رکھتی تھیں۔ مگر حضور پُر نور کی صحبت اور تعلیم کی روشنی میں دعاؤں کا رنگ ہی نرالا ہو گیا تھا۔ اور بجائے محض رسم کے اُنکے اندر کیا بلحاظ کیفیت اور کیا بلحاظ کمیت ایک حقیقت پیدا ہو چکی تھی میں پہلے محض قشر پر قناعت کئے ہوئے تھا جس کے اندر مغز نہ تھا۔ مگر اب خدا نے مغز عطا فرما رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ خالصتاً میرے سید و مولیٰ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عطا کا نتیجہ تھا۔ کہ اس طرح میں ایسی سخت گھڑیوں میں ہلاکت و بربادی سے بچ گیا۔ ورنہ دیرم دتّاں میں ہی جو حالات پیش آئے تھے کسی کو تباہ و برباد کرنے کیلئے کافی تھے۔ فالحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔

الغرض میں نہائت ہی ہم وغم اور رنج والم کی حالت میں اِس گنجان شیشم کے گھنے سایہ دار حصّہ میں داخل ہُوا۔ مگر وہاں سے نکلنے سے قبل مجھے ایسا انشراح بخشا گیا۔ اور مجھ پر سکون و اطمینان نازل فرمایا گیا۔ کہ مصائب و خطرات کی وہ بھیانک تصویریں جو ایک آدھ گھنٹہ ہی قبل مجھے کھانے کو دوڑتیں، خواب ہائے پریشان بن بن کر ڈراتیں اور ہلاکت آفرین منظر پیش کرتی تھیں۔ کافور ہو گئیں۔ میں بالکل ہلکا پھلکا اور ہشاش بشاش واپس اپنی قیامگاہ میں پہنچا۔ جہاں والد محترم بعض دیگر رشتہ داروں سمیت میری انتظار میں تھے۔ وہ سب ملے اور ایسے رنگ میں ملے کہ مجھے اپنی دعاؤں کی قبولیت کا یقین ہو گیا۔ اور اسطرح اللہ تعالےٰ نے مجھے اس موقعہ پر بھی شیطانی حملہ سے نجات دیکر اپنے ہاتھ سے بچا لیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

تھوڑا حصّہ دن کا جو باقی تھا۔ اِسی طرح ملنے ملانے اور نشست و برخاست میں گذر گیا۔ اور سرِ شام میں پھر تھوڑی دیر کے لئے انسانی نظروں سے اوجھل ہو کر خدائے قدوس کے حضور سجدات شکر گذاری اور اظہار محبت و انکساری کے لئے حاضر ہُوا۔ اور فریضہ نماز ادا کر کے طعام و کلام سے فارغ ہو کر لیٹ گیا۔ مہمان نوازوں کو علاوہ مہمان نوازی کے فرائض کے لڑکی کو رخصت کرنے اور رختِ سفر باندھنے کی بھی فکر تھی۔ لہٰذا مجھے گو نہ فراغت مل گئی۔ اور اس طرح قریباً آدھی رات تک گہری نیند سو لیا۔ آدھی پچھے جب گھر والے فارغ ہوئے روانگی کی تیاری کا حکم ہُوا۔ وہی یکّہ بان ہمارا رفیق سفر تھا۔ قافلہ میں اب ایک ساتھی اور کچھ سامان کی ایزادی ہو گئی تھی۔ گھر والوں نے ہندوآنہ رسم و رواج کے مطابق رخصت کیا۔ اور گاؤں سے تھوڑی دور باہر الوداع کہنے کو بہت سے عورت مرد آئے اور ابھی رات کا اندھیرا ہی تھا۔ کہ ہمارا یکہ جس راہ سے آیا تھا۔ اُسی سڑک سے واپس ہولیا۔ راوی کا پتن ناؤ سے پار ہوئے۔ اور ڈیرہ بابا نانک پہنچے۔ جہاں سے تھوڑی دیر سستانے اور گھوڑے کو تازہ دم کرنے کے بعد ہمارا وہی یکّہ براستہ فتح گڑھ چوڑیاں امرتسر کیطرف روانہ ہُوا۔ اور دو ایک جگہ قیام کرنے اور تازہ دم ہونے کے بعد چلتے چلتے بعد دوپہر ہم لوگ امرتسر رامباغ گیٹ کے باہر پہنچے۔

امرتسر پہنچکر والد صاحب نے یکّہ بان کو کرایہ کے علاوہ کچھ انعام دیکر رخصت کیا۔ اور خود شہر کے اندر جاکر کچھ ضروریات خریدکیں مجھے ساتھ ہی ساتھ رکھا اور تیسرے ساتھی کو چند مسافر مستورات کے پاس بٹھا گئے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے نمازوں کی ادائیگی سے روکا تو نہیں تھا۔ مگر اتنا ضرور فرماتے یا چاہتے تھے۔ کہ میں مخفی طور سے ادا کیا کروں۔ اور احتیاط کروں کہ تیسرے ساتھی کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔ میرے قرآن شریف۔ حزب المقبول اور سلسلہ کی چند کتب کا احترام بھی مدّنظر رکھتے تھے۔ جو میں قادیان سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ مگر ساتھ ہی اُن کی یہ بھی خواہش تھی۔ کہ کوئی اور اِن کتب کو دیکھ نہ پائے۔ لہٰذا بہت احتیاط سے اس بکس کو عموماً مقفل ہی رکھتے تھے۔ اور سفر میں عموماً تلطف اور شفقت ہی سے پیش آتے رہے۔

اسی روز امرتسر سے بذریعہ ریل گاڑی لاہور اور لاہور سے ملتان لائین کو روانہ ہو کر رات کے کسی حصّہ میں مجھے اب یاد نہیں رہا۔ کسی سٹیشن پر اترے جہاں ایک اونٹ اور دو گھوڑیوں کا انتظام تھا۔ جو ہماری انتظار میں تھے بعد میں معلوم ہُوا کہ والد صاحب اپنے علاقہ سے اسی راہ آئے تھے۔ اور یہ سواری اسی دن اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ تاکہ واپسی میں دِقت نہ ہو۔

گاڑی سے اُترتے ہی سامان ٹھیک کر کرا کے منزل مقصود کی راہ لی اور بقیہ حصّہ رات اور دن بھر چلنے کے باوجود کسی ایسے مقام پر نہ پہنچ سکے۔ کہ اطمینان سے رات گذار لیتے۔ زنانہ ساتھ کی وجہ سے رفتار بھی محدود رکھنی پڑی۔ اور کچھ راستہ بھی نامعلوم پُرخطر اور ویرانے کا تھا۔ لہٰذا سفر کو متواتر جاری ہی رکھنا پڑا۔ اور اسطرح بمشکل نصف شب گذری تھی۔ کہ ہمارا یہ قافلہ ڈچکوٹ پہنچا۔ جہاں والد صاحب کے ایک گہرے رازدار دوست پٹواری ٹھہر رہتے تھے چنانچہ ان کے کوارٹر پر پہنچکر دستک دی۔ دروازے کھٹکھٹائے۔ اور بمشکل انکو بیدار کر کے گھر میں داخل ہوئے۔

ڈچکوٹ اُن ایام میں نئی آبادی کی وجہ سے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اور علاقہ کی تجارتی منڈی ہونے کے باعث مشہور تھا۔ والد صاحب کی کوشش تو یہی تھی۔ کہ سیدھے اپنے حلقہ میں پہنچیں۔ تاکہ میرے متعلق کوئی استفسار کرے نہ کسی پر اصل حقیقت آشکار ہو۔ والد صاحب کا حلقہ ڈچکوٹ سے ملحق تھا۔ اور جس گاؤں میں ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ تین چار میل ہوگا۔ مگر سواریوں سے زیادہ سوار تھک رہے تھے۔ اس وجہ سے مجبوراً مقام کرنا پڑا۔ اور یہی وہ سرزمین ہے۔ جہاں سے میرے لئے رنج والم اور دکھ درد کے دروازے کھولے گئے۔ میرے واسطے مصائب کا دور شروع ہو گیا۔ میں مشکلات میں چاروں طرف سے ایسا محصور ہُوا۔ کہ بار ہا اُن سے نجات کی راہ نہ دیکھ کر جان پر کھیل جانے کو جی کیا کرتا۔ زمین باوجود فراخی کے مجھ پر تنگ ہو گئی۔ اور میں باوجود بھاگ نکلنے کی سچی کوشش کے بھاگنے کی راہ نہ پاتا تھا۔ میری مادر مہربان اور شفیق باپ میری زندگی کو اپنے لئے ایک لعنت سمجھکر میری موت کی تمنّا کیا کرتے تھے۔ میرے بہن بھائی جو کبھی میرے پسینہ کی جگہ اپنا خون گرانے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اور یہ سلسلہ نہ صرف زبانی سختی اور طعن و تشنیع تک ہی محدود تھا۔ بلکہ اس سے گذر کر ہاتھوں اور لاتوں تک اور پھر کھلتے کھلتے چھڑیوں اور لاٹھیوں کے وار اور مظاہرے بھی اکثر ہُوا کئے اور ایک وقت تو حالت یہاں تک پہنچ گئی۔ کہ چھریوں اور کلہاڑیوں تک کے حملے کئے گئے۔ اور کئی کئی نے مل مل کر مجھے گرایا۔ اور چھاتی پر بیٹھ بیٹھ کر جان تک لینے کی کوشش کی۔ یا خوف دلایا۔ اور اسطرح آٹھ نو ماہ کا طویل زمانہ میرے لئے نہائت درجہ رنج و غم اور درد و ستم کا زمانہ تھا۔ تکلیف دینے کی کوئی بات نہ تھی۔ جو میرے لئے روا نہ تھی۔ اور ظلم اور تشدّد کا کوئی طریق نہ تھا۔ جسے میرے بزرگوں اور عزیزوں نے آزمانے کی کوشش نہ کی ہو۔ میرے اس درد کی داستان بہت لمبی اور اتنی دردناک ہے۔ کہ راجہ ہرشچندر کی مصائب و مشکلات اس کے سامنے ہیچ اور حقیقت رائے کے مبالغہ آمیز واقعات اس کے مقابل میں ایک افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُن لوگوں نے رائی کو لے کر پہاڑ بنا دیا۔ اور طرح طرح کی رنگ آمیزیوں اور ملمع سازیوں سے اپنی خاص مصلحتوں کے ماتحت بعض بالکل معمولی واقعات کو مذہبی رنگ چڑھا چڑھا کر اپنی قوم کے جذبات کو دوسرے مذہب کے پیروؤں کے خلاف بھڑکا بھڑکا کر بعض سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیا۔ اور اس کام کے لئے بعض عیار لوگوں نے زندگیاں تک وقف کر دیں۔ اور اس پروپیگنڈا کے لئے ملک کے طول و عرض میں گہری سازشوں کا جال بچھا دیا۔ مگر جو کچھ

مجھ پر گذری اور میرے ساتھ بیتی۔ وہ چونکہ میرے اپنے ہی بزرگوں، محسنوں اور عزیزوں کی طرف سے تھی۔ کسی غیر کا اس میں دخل تھا۔ نہ دوسروں کی طرف وہ مظالم منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ اور نہ ہی میں نے اُن امور کا پروپیگنڈا کرنا پسند کیا۔ کیونکہ آخر وہ میرے ہی جنم داتا یا گوشت پوست تھے۔ اور علاوہ بریں بوجہ اس خیال کے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا۔ قومی غیرت وحمیت اور ننگ وناموس کے نام پر کیا۔ اور خواہ انہوں نے انتہائی مظالم ہی روا رکھے۔ مگر ان کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا۔ وہ بہرحال مشفقانہ اور ہر قسم کی عداوت دشمنی اور جوش انتقام سے مبرا تھا۔ اور جو واقعات میرے والدین اور رشتہ داروں کی مصیبت، تکلیف، بدنامی اور خانہ بربادی کے میرے سامنے ہیں۔ جو اُن کو میری تلاش اور واپسی کے دوران میں پیش آئے اس کے مدنظر میں بھی اُن کو گونہ معذور اور ناقابل ملامت سمجھتے ہوئے قابل معافی سمجھتا ہوں۔ اور یہی وجہ تھی۔ کہ میں نے ان حالات کی تفاصیل کا بیان کرنا کبھی پسند نہ کیا۔ اور اب بھی جو مجملاً تھوڑا سا ذکر بے ساختہ اُن حالات کی یاد میں نکل گیا ہے۔ میں اس اظہار پر بھی ندامت و شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ بہرحال وہ لوگ میرے واجب التعظیم بزرگ تھے۔

ڈلہوزی کے پٹوار خانہ کے پاس پہنچکر جب ہم لوگ سواری سے اترے اسوقت والد صاحب نے مجھے الگ لے جا کر جو کچھ کہا اور جس رنگ میں کہا وہ جہاں میرے والد صاحب کے دلی ارادوں اور عزم کا آئینہ دار، اُن کی قلبی کیفیات اور منتہائے نظر کا مظہر تھا۔ وہاں میرے افسردہ دل کے لئے ایک ایسی چوٹ تھا جس سے میری ہستی کی بنیادیں ہل گئیں۔ مجھ پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور آسمان وزمین میرے لئے اندھیر ہو کر رہ گئے۔ مجھ پر ایسا سناٹا چھایا۔ اور ایسا لرزہ آیا۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے آپ سے بالکل کھویا گیا۔ میری زبان بند رہ گئی۔ اور دل ودماغ ایسا بے حس ہوا۔ کہ والد صاحب کو کوئی جواب بھی نہ دے سکا اور میرے حواس اس وقت تک بجا نہ ہوئے جب تک والد صاحب کی زیادہ سخت اور کرخت آواز نے پہلے سے بھی زیادہ سختی وشدت سے اپنے مطالبہ کو نہ دہرایا۔

وہ الفاظ سخت اور طریق خطاب نہائت رنجدہ تھا۔ اور چونکہ لفظ لفظ وہ الفاظ مجھے محفوظ بھی ہیں اور جو یاد بھی ہیں۔ میں اُن کو تحریر میں لا کر کوئی بُری یادگار قائم رکھنا نہیں چاہتا۔ لہذا ان کا خلاصہ در خلاصہ اور مفہوم نرم ترین الفاظ میں لکھ دینا ہی مناسب سمجھتا ہوں جو یہ تھا۔ کہ:۔

اب چونکہ ہمارا اپنا علاقہ آ گیا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ ایک رنگ کی حکومت ہمیں یہاں میسر اور ہماری عزت وعظمت کا چرچہ ہے۔ کسی کی مجال نہیں ہماری طرف آنکھ بھی اٹھا سکے۔ مگر تم نے جو کام کیا ہے۔ اگر اس کا علم کسی کو بھی ہو گیا۔ تو ہماری ساری عزت برباد اور رعب کافور ہو جائیگا۔ ہماری ناک کٹ جائیگی۔ اور ہم کسی کو مُنہہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ لہذا خبردار اب نڑی نماز اور کڑا قرآن پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ برابر تین روز سے میں تمہاری ان کرتوتوں کو دیکھتا اور خون کے گھونٹ پیتا رہا ہوں۔ اب بھی اگر تم ان حرکات سے باز نہ آئے۔ اور مسلمانی رنگ تمہاری کسی طرز وادا سے بھی ظاہر ہوا۔ تو یاد رکھو کہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔ تمہارا کام تو بہرحال تمام کر دیا جائیگا پیچھے جو ہوگا دیکھا جائیگا۔ تمہیں خوب معلوم ہے۔ کہ اس علاقہ میں کوئی تمہاری مدد تو کیا۔ خبر بھی نہ پا سکے گا۔ کیونکہ خون کر کے کھپا دینا ہمارے واسطے یہاں کوئی مشکل نہیں خصوصاً تمہارے جیسے نالائق اور ناہنجار لڑکے کا تو ہونے سے نہ ہونا ہی اچھا ہے۔ تم وہاں خط وکتابت کے وعدے اور عہد وپیمان کر آئے ہو۔ مگر میں دیکھونگا کہ کون تمہیں لکھتا ہے اور کس کو تم جواب دیتے ہو۔ کسی مُسلے کی مجال کیا۔ کہ تم سے مل بھی سکے۔ پس اگر بھلا چاہتے ہو۔ تو سیدھے تیر ہو جاؤ۔ اور مسلمانی کے خیال کو بھی دل سے نکال دو۔ وغیرہ وغیرہ

یہ وہ خلاصہ در خلاصہ ہے اس خطاب کا جو والد صاحب نے انتہائی غم وغصہ اور شدت غیض وغضب کے جوش میں اپنے جلے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو مجھ سے فرمایا۔ جسے میں نے پہلی مرتبہ بھی سنا اور دوبارہ اور بھی تیز وتند الفاظ میں اور زیادہ غضب آلود لہجہ میں سُنا جس کے نتیجہ میں سچ مچ میرا سارا جسم کانپ گیا۔ اور دہشت کے مارے میں سہم گیا۔ مگر پھر بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ اور خاموش کھڑا رہا۔ جواب کا نہ دینا اور خاموشی اختیار کئے رہنا تسلیم ورضا کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ والد صاحب کے مقصد ومنشا کے خلاف ایک خاموش احتجاج تھا۔ اور اُسے خود والد صاحب بھی محسوس کرتے تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ خاموشی اُن کی مرضی کو پورا کرنے اور ان کی خوشی حاصل کرنے کیلئے نہیں۔ بلکہ ان کی مخالفت پر اصرار اور ضد تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے جھٹک کر ایک قسم کے رنج گلوگیر کی حالت میں فرمایا "اچھا گھر چل کر دیکھا جائیگا" اور اس کے بعد اپنے دوست کے کمرہ میں جا داخل ہوئے۔ اور میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ والد صاحب الگ ایک کمرہ میں دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ جو زیادہ تر اسی پیش آمدہ امر کے متعلق تھیں۔ وہ صاحب اگرچہ والد صاحب کے گہرے دوست اور راز دار تھے۔ مگر میں نے محسوس کیا۔ کہ والد صاحب نے اس امر خاص کو اُن سے بھی پوشیدہ ہی رکھا۔ اگرچہ میری تلاش میں اپنی سرگردانی وسرزنی اور بھاری اخراجات کی وجہ سے مالی نقصان اور بربادی کے واقعات کے ذکر میں کوئی اخفاء نہ رکھا۔ مگر میرے مسلمان ہو جانے اور قادیان پہنچنے کا ذکر تک بھی نہ کیا۔ بلکہ اور ہی اور قصے میرے کسی چھاپہ خانہ میں ملازم ہو کر بڑا لائق کام کرنے والا اور نامور ماہر فن متصدی بن جانے کے افسانے سناتے رہے جن کے باعث کارخانہ دار مجھے چھوڑنا نہ چاہتے تھے اور کہ ان کو مجھے وہاں سے نکالنے میں سخت ترین مشکلات کا سامنا ہوا۔ اور اُلٹا لینے کی بجائے کچھ دے کر مجھے فارغ کرانا پڑا۔ اسی اخفاء کے خیال سے والد صاحب نے میرے ساتھ علیحدہ زیادہ دیر ٹھہرنا پسند نہ کیا تھا اور جلد مکان میں آ گئے تھے۔ کہ صاحب خانہ کو شبہ نہ ہو۔ والد صاحب چونکہ متواتر ہفتوں سے سفر میں رہنے کی وجہ سے اور خصوصاً میرے پا لینے کے بعد تین چار رات سے آرام کی نیند نہ سو سکے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ہی سو کر غافل ہو گئے۔ مگر مجھے اس تازہ زخم کی وجہ سے چین نہ پڑتا تھا۔ گو تھکان اور کوفت مجھے بھی بے حد تھی۔ اور جسم میرا بھی آرام مانگتا تھا۔ مگر دل کا درد اور جگر کی سوزش بے قرار کئے دیتی تھی۔ کروٹیں لیتا۔ مگر کسی پہلو آرام نہ ملتا۔ ع

دل کی لگی بجھائے کون ؟

خیالات کے تموج اور اجتماع سے دماغ خود پھٹنے کو تھا اس صورت میں بھلا نیند کی گنجائش کہاں۔ اسی طرح قسم قسم کی اُدھیڑ بن اور سوچ وبچار میں رات کی گھڑیاں گن رہا تھا کہ پہلو کے کمرہ کے سکوت نے میرے دماغ کو کسی دوسری طرف پھیر دیا جس کے ساتھ ہی میں لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور دروازے پر ہاتھ مارا کہ کھول کر نکل جاؤں۔ مگر وائے قسمت کہ در بند تھا۔ اور میں محصور۔ ناچار کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور سر تھام کر رہ گیا۔ اور لاملجاء ولامنجاء منك الّا الیك کے ورد میں مصروف ہو گیا اور دل دعا کی طرف جھکتا گیا جس کے بغیر اور کوئی راہ کھلی نہ تھی۔ مرغ سحر بولے جس سے رات کی آخری گھڑیاں معلوم کر کے اس فرصت کو غنیمت جانا۔ اور کارساز حقیقی سے راز ونیاز اور عرض حال میں مصروف ہو گیا۔

سچ ہے مصیبت اور دکھ درد کی رات لمبی ہو جاتی ہے۔ اور ختم ہونے میں نہیں آتی۔ مگر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کہ جب درد میں لذت پیدا ہو جائے تو نہ درد درد رہتا ہے نہ اس کا زمانہ لمبا اور طویل معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا جلد ختم ہو جانا گونہ حسرت وتکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اور ایک قسم کی پیاس اور تشنگی معلوم ہونے لگتی ہے۔ میں ایک قسم کے ذوق اور لذت وسرور میں تھا۔ کہ اللّٰہ اکبر۔ اللّٰہ اکبر۔ اللّٰہ اکبر کا روح پرور نغمہ کان میں پڑا۔ جس سے میرے حواس میں تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بعد عجز ونیاز ذقت کا فرض ادا کیا۔ اور آنے والے حالات کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ جن کے متعلق دل میں ایک کشمکش اور خلجان تھا۔

گھر والے جاگے۔ والد صاحب ہوشیار ہوئے

اور میرا دروازہ کھول کر تجاہل عارفانہ کے رنگ میں دروازہ کے باہر سے بند ہو جانے پر افسوس کرکے مجھے ساتھ لیا اور جنگل وغیرہ سے فراغت پاکر جلد جلد روانگی کی تیاری کی۔ اور صاحب خانہ کے اصرار کے باوجود اندھیرے ہی اندھیرے روانہ ہو کر سویرے ہی سویرے اپنے منزل مقصود بھاگو وال یعنی غالباً چک نمبر ۲۶ جا پہنچے۔ یہ بھاگو وال ضلع گورداسپور کے بھاگو وال سرداراں ہی سے وہاں جاکر آباد ہوا ہے۔ اور جہاں سکھ سردار یا زمیندار وہاں جاکر آباد ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بعض ان کے کمین مسلمان بھی گئے ہیں جن میں بعض بردار اور چوکیدار کشمیری بھی تھے۔ جو ہمارے محترم برادران سیکھوانی کے رشتہ دار اور واقف کار بھی تھے۔ یہ حلقہ ٹپوادہ پانچ دیہات پر مشتمل تھا۔ اور مصلحت الٰہی کہ پانچوں دیہات سکھوں بلکہ زبردست اور متعصب سکھوں کے تھے۔ جن میں سے ایک دیہہ میں جو سڑک ڈھکوٹ کے کنارے واقعہ تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ ایک مرکزی گوردوارہ اور ان کا مذہبی مرکز بھی قائم تھا۔ جہاں میرے والد صاحب بھی خاصہ حصہ لیا کرتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں سکھوں میں وہ مذہبی لحاظ سے بھی محبت وعزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور اس طرح ان کا اپنے حلقہ میں دہرا اثر ورسوخ تھا اور اس پر ان کو ایک قسم کا حد سے بڑھا ہوا ناز تھا۔ اور اسی کی طرف انہوں نے ڈھکوٹ پہنچ کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔

ہمارا یہ مختصر سا قافلہ ابھی گاؤں سے باہر ہی تھا کہ والد صاحب قبلہ اپنی سواری کو ایڑ لگا کر آگے نکل گئے تاکہ گھر والوں کو ہمارے آنے کی اطلاع دیں۔ آج کے سفر میں میں ان کی ہر حرکت وسکون اور طرز وادا میں ایک خاص شان محسوس کرتا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اب یہ ان کا علاقہ اور حلقہ تھا۔ مگر زیادہ تر اس وجہ سے کہ ان کو اپنی کامیاب واپسی ایک فاتحانہ شان وشوکت کے اظہار پر آمادہ کر رہی تھی۔ کم وبیش چھ ماہ متواتر کی دوڑ دھوپ اور تگ ودو کے بعد کئی ویرانے اور جنگلوں، سنسان بیابانوں کی خاک چھاننے کے بعد بیسیوں شہروں ودرجنوں دیہات کے گلی کوچوں کی چھان بین کے بعد اور ہزاروں روپیہ کے بے دریغ بہا دینے کے بعد وہ حصول مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے گویا قدرت نے بھی ایسی شان وشوکت کے اظہار کا موقعہ میسر فرمایا تھا۔ اور آج وہ قدرت کی اس فیاضی سے جی کھول کر اور پیٹ بھر کر فائدہ اٹھا رہے تھے۔

قادیان ہاں مقدس وپیاری بستی قادیان کی یاد دل سے کسی وقت بھی محو نہ ہوتی تھی۔ اور میں ہر وقت ہی عالم خیال میں کوچہ ہائے دارالامان میں پھرتا رہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ میرے والد صاحب میرے قادیان سے لے آنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اور میں ان کی کڑی اور نہایت کڑی نگرانی میں ایک اسیر بہ دست وپا کی شکل محبوس وگرفتار تھا۔ اور ان کی مرضی کے خلاف چار قدم بھی ادھر ادھر نہ جا سکتا تھا۔ مگر میری روح یقیناً آزاد تھی۔ اور دل ودماغ ہر قسم کی قیود وبند اور نگرانی کی حدود سے بالا تھے۔

ان مشکلات ومصائب کے پہاڑ تلے دبے ہوئے بھی میری روح اپنے آقائے نامدار کی مجلس میں پہنچ کر حضورؑ کے کلمات طیبات سے مستفیض ہوتی اور حضور پر نور کی زبان فیض ترجمان سے الٓمٓ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لایفتنون کی ٹریلی اور کیف آور گونج گوش ہوش سے سن پاتی تو یقیناً اس میں زندگی کی ایک جھلک اور امید کی لہر دوڑنے لگتی جس سے مجھے ان مشکلات اور ابتلاؤں پر فتح پانے اور غالب آنے کی قوت وعزم میسر آجاتا۔ اور دل کو عجیب سکون اور ڈھارس نصیب ہوتی۔

دارالامان کی مختصر سی اس زندگی میں بارہا میں نے حضورؑ کی زبان مبارک سے قرآن کریم کی یہ آیت سنی اور سن سن کر یہی یاد ہوگئی تھی۔ اور جس موقعہ ومحل پر حضور اس کو ذکر فرمایا کرتے اور جو مفہوم ومقصد حضورؑ اس سے لیا کرتے تھے۔ وہ میرے ذہن میں مستحضر ہو جاتا۔ اور جو شاہیں حضورؑ اس مضمون کی تائید میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات اور واقعات کا ذکر فرما کر بیان فرمایا کرتے تھے یاد آکر میرے دل کو قوی کر دیا کرتی تھیں۔

سیدنا حضرت مسیح پاک علیہ الف الف صلوٰۃ والسلام کا ایک اور مقولہ بھی ایسے اوقات میں اکثر میری راہنمائی کیا کرتا تھا۔ "خدا داری چہ غم داری" یہ کلمات بھی حضورؑ کی زبان مبارک سے اکثر سننے میں آیا کرتے تھے۔ اور اسی وقت مجھے یاد ہو چکے تھے۔ ورنہ اس سے قبل میں نے یہ کلمات نہ کبھی سنے تھے نہ کہیں پڑھے تھے۔ یہ کلمات اپنے اندر جو مقناطیسی اثر رکھتے ہیں۔ یاد آکر لازماً مجھ پر بھی اثر انداز ہوتے اور زندگی میں تازگی کی روح پھونک دیا کرتے تھے۔

قصہ مختصر جوں جوں ہمارا قافلہ اس بستی کی طرف بڑھتا اور قریب ہوتا جاتا تھا۔ توں توں میری روح پیچھے کو بھاگتی اور اپنے آقا کے حضور فریاد کرکے طالب مدد ودعا ہوتی تھی۔ ابتدا سے انتہا تک کے سارے حالات وواقعات آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔

(۱) اوّل مرتبہ حضرتؑ کے حضور پیش ہونے کے وقت میری کم عمری اور بچپنے کی وجہ سے جو کچھ اس مرسل یزدانی نے فرمایا (۲) والد صاحب کے قادیان پہنچ کر میرے حصول کی کوشش کرنے کے نتیجہ میں آخر جو کچھ حضور نے فرمایا (۳) مخدومنا حضرت حکیم الامت مولانا مولوی نورالدین اعظم کی درخواست پر کہ "حضور نے عبدالرحمن کو والد کیساتھ جانے کا حکم دیا ہے۔ اگر حضور پسند فرمائیں تو بھائی عبدالرحیم کو ان کے ہمراہ بھیجدیا جائے" کے جواب میں جس رنگ میں اور جس جوش میں میرے آقا نے اظہار خیال کیا اور جو کچھ فرمایا یہ سب کچھ ایک طرف میرے سامنے تھا۔ اور دوسری طرف وہ بستی اور وہ عزیز ورشتہ دار جنکو میں ۶ رجون ۱۸۹۵ء کے دن ہمیشہ کے لئے الوداع کہکر نکل کھڑا ہوا تھا۔ اب پھر آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ بلکہ ہر قدم مجھے ان کے قریب کرتا جا رہا تھا۔ ایسے نازک وقت میں میرے دل میں کیا کیا گذر رہا تھا۔ اور کس کس قسم کے خیالات اٹھتے اور کیا کیا اثرات پیدا کرتے تھے ان کا جمع کرنا اور لکھنا میرے لئے ناممکن ہے۔ انکو میرے خدا اور میرے دل ناتوان کے سوا کوئی خیال میں بھی نہیں لا سکتا۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ وہ پردہ راز ہی میں رہیں۔

والد صاحب کے گاؤں پہنچنے اور خاص انداز سے پہنچنے کے باعث ایک چرچا ہو چکا تھا۔ گھر والوں کو اطلاع مل چکی تھی۔ اس وجہ سے جہاں گاؤں کے مرد اور عورتیں ہمیں دیکھنے کو گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور ہمیں آتا دیکھ کر جو جس کے جی میں آتا کہتا۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ کوئی خوشی کا اظہار کرتا۔ کوئی ملامت کرکے دکھے دل کو اور بھی دکھاتا تھا۔ کسی کا لہجہ مشفقانہ تھا۔ تو کسی کا سخت وکرخت اور طعن آلود اور میاں کا اکثروں نے مصلحت اور حکمت سے نصیحت کا پہلو اختیار کیا تو بعض نے محبت کیساتھ ساتھ ہمدردی بھی جتائی۔ اور اس طرح مجھے تلخ وگرم اور سرد ونرم میں سے گذرتے ہوئے بستی کے شمالی جانب والد صاحب کے کوارٹر تک جانا پڑا جہاں گاؤں کی عورتوں کا ایک ہجوم ہمارے پہنچنے سے قبل ہی قبل والدہ محترمہ اور عزیزہ ہمشیرہ کو مبارکباد کہنے کی غرض سے جمع ہو چکا تھا۔

گھر پہنچے۔ واجبی سلام کلام کے بعد رسمی آؤ بھگت میل ملاپ اور پیار دلاسا پر ہی اکتفاء رہا۔ شکوے شکایات اور غم وغصہ کے اظہار کو کسی دوسرے فارغ وقت کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ اور موقعہ کے مدنظر بڑے ضبط سے کام لیا گیا۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ یہ مرحلہ ہمارے نئے ساتھی کی وجہ سے میرے لئے آسان ہوگیا۔ کیونکہ مستورات دیہہ اور گھر والوں کی ساری توجہ انہیں کی طرف منعطف ہوگئی۔ اور اسطرح مجھے کچھ وقفہ علیحدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور عرض حال اور التجا ودعا کیلئے مل گیا۔ اور چونکہ آنے جانے والی عورتوں اور مردوں کا سلسلہ دن بھر ہی جاری رہا۔ اس وجہ سے مجھے گو نہ فرصت ہی رہی۔ اور آج کے دن کے فرائض کی ادائیگی کا بھی اللہ کریم نے بہترین اور آسان راہ پیدا کر دیا۔

رات کے اندھیرے میں جب کہ گھر والوں کو فرصت ہوئی عزیز واقارب سے فارغ ہو کر والدہ محترمہ، ہمشیرہ عزیزہ اور میرے دونوں بھائی میرے گرد جمع ہوئے۔ اور لگے باری باری اپنے دلوں کا بخار اور سینوں کی بھڑاس نکالنے۔ گھر والوں کو میرے اسلام کی اطلاع تھی۔ اس وجہ سے ان کے دل بہت ہی بھرے ہوئے تھے۔ نہ معلوم دن بھر کس ضبط سے انہوں نے کام لیا۔ اور کیسے اتنا لمبا صبر کر سکے۔ اس فرصت اور تنہائی میں جہاں سبھی پھوٹ پھوٹ کر رو دئے وہاں والدہ محترمہ نے تو حق مادری کا بھی دل کھول کر استعمال فرمایا۔ اور جوش ورنج میں یہاں تک بڑھ گئے۔ کہ چاقو لیکر اپنے سینہ تک کو چاک کرکے مجھے اپنے داغہائے دل دکھانے کو

آمادہ ہو گئے۔ اور اگر عزیزہ ہمشیرہ ہوشیاری اور ہمت سے کام لیکر ان کا ہاتھ نہ روک لیتیں۔ تو خدا معلوم کیا ہو جاتا۔ میں سر ڈالے بیٹھا تھا۔ مجھے تو خبر بھی نہ تھی۔

رات قریبًا ایسی ہی کشمکش اور گریہ وزاری میں بیت گئی۔ والدہ اور ہمشیرہ نہ سوئیں اور نہ ہی انہوں نے مجھے سونے دیا مطالبہ اُن کا سخت تھا جس کے لئے انہوں نے کبھی محبت و پیار کی انتہا کر دی تو کبھی گریہ و بکا کی کوئی حد نہ رہنے دی کبھی قومی حمیت اور خاندانی عزت کے واسطے ڈالے تو کبھی ننگ و ناموس پر جان نثار کر دینے والے اسلاف کے تذکرے سُنا سُنا کر اپنے مطلب کا بنانے کی کوشش کی۔ کبھی مجھے ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش کی اور جان تک کا خوف دلایا۔ تو کبھی اپنی جانوں پر کھیل جانے اور میرے سر چڑھ مرنے کی دھمکیاں دیں۔

والد صاحب نے گو اس وقت کوئی دخل نہ دیا۔ مگر اس ساری کارروائی کو پاس ہی بیٹھے دیکھا سنا کئے۔ کبھی کبھی کوئی فقرہ والدہ محترمہ کی تائید یا ہمشیرہ عزیزہ کی حمائت میں فرما دیتے تھے۔ اور اس طرح گویا بالواسطہ وہ بھی وہی کام کر رہے تھے۔ مگر مطالبہ ان کا ایسا سخت اور ایسا کڑا تھا۔ کہ اس کے مقابلہ میں اُن کے سارے ہی ہتھیار کند وِ نکمّے اور ہر قسم کی کوششیں بیکار اور بے سود تھیں۔ اور میں ان کو قبول کرنے کیلئے انتہائی خوف کی وجہ سے تیار تھا نہ انتہائی طمع و محبت مجھے اس کیلئے آمادہ کر سکتی تھی۔ اور جس غیرت و حمیت کا واسطہ مجھے دیا جاتا تھا وہی غیرت و حمیت مجھے اپنے مقام پر قائم اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتی۔ اور جو کارنامے سنا سنا کر مجھے اپنے مقام سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی تھی اس سے ہزار ہا درجہ بہتر و اعلیٰ اور حقیقی کارنامے اسلام کی خاطر قربانیاں کرنے والوں کی میرے پیش نظر تھیں جن کا زندہ نمونہ اور تازہ مثالیں اللہ تعالےٰ نے مجھے دیکھنے کا نہ صرف موقعہ دیا بلکہ اُن کی صحبت میں رہ کر اُن کی قوت قدسی اور روحانیت سے متمتع ہونے کی سعادت نصیب کی جس کی برکت اور طفیل سے میرے بزرگوں اور محسنوں کے قوی سے قوی دلائل اور کاری سے کاری حربے بھی میرے لئے ہیچ اور بے اثر تھے۔ والدہ اور ہمشیرہ کے جذباتی تأثرات بھی میرے قلب کے اس لذت و سرور کو دور کرنے سے عاجز تھے۔ گھر والے "گربہ کشتن روز اوّل" کی فکر میں تھے۔ ان کو اندیشہ تھا۔ کہ بات نکل گئی۔ تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائیگا۔ اور پھر اس کا کوئی علاج نہ ہو سکے گا۔ ان کی ساری کوشش اور سعی اسی یقین و وثوق اور قوت و ارادہ سے تھی۔ کہ وہ ضرور کامیاب ہونگے۔ کیونکہ جس رسمی اسلام کے خلاف اُن کا جہاد تھا۔ اور جن نام کے مسلمانوں کو مدنظر رکھ کر مجھے اسلام و مسلمانی سے پھیرنے کی جد وجہد کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا گمان ایک حد تک اپنے اندر کچھ حقیقت و اصلیت بھی رکھتا ہوگا۔ مگر وہ میرے متعلق ایک غلط فہمی کا شکار تھے۔ اور اُن کی ساری تگ و دو چونکہ امر واقعہ سے ناواقفیت پر مبنی تھی۔ جو ابتداء سے لیکر انتہا تک متواتر کئی ماہ انہوں نے جاری رکھی۔ اور باوجود استقلال کے وہ کامیابی کا مونہہ نہ دیکھ سکے۔ وہ حقیقی اور زندہ اسلام اور اس کے اثر و جذب سے بے خبر تھے۔ ان کو اس بات کا علم ہی نہ تھا۔ کہ حلاوت ایمان میسّر آجانے کے بعد انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ورنہ شائد نہ وہ اتنی سرگردانی کی زحمت اٹھاتے۔ نہ اپنے مال و منال کو یوں اٹھاتے اور نہ ہی وہ مجھے طرح طرح کی اذیّت پہنچا کر خون جگر کھاتے بلکہ میرے اسلام لے آنے کی اطلاع پا کر ہی صبر کر بیٹھتے اور اصلیت بھی یہی ہے۔ کہ اگر اللہ تعالےٰ نے خود ہی میری دستگیری فرما کر اس نور اسلام سے منور نہ کیا ہوتا۔ جسے اس نے اس زمانہ میں دوبارہ اس نبی آخر الزمان کے ذریعہ زندہ کر کے زندگی بخش اور روح پرور بنا دیا ہے۔ تو شائد ان کی ترغیب و ترہیب اور مسلسل و سرگرم مساعی کا کوئی نتیجہ کسی نہ کسی رنگ میں دیکھنا اُن کو نصیب ہو ہی جاتا۔ مگر یہاں تو "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والا معاملہ تھا۔ اس "بیمار محبت و وفا" کا مرض بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی گیا۔ اور ان کی ساری مساعی اس کشتِ ایمان کو کھاد ہو کر لگتی رہیں۔

وہ رات گذری دن چڑھا اور گذر گیا۔ اور اسی طرح چند روز تک جس طرح لیل و نہار بدلتے رہے میرے والدین اور اقارب کی سرگرمیاں اور مساعی بھی بدلتی ہوئی جاری رہیں کبھی نرمی ہوتی تھی۔ اور کبھی گرمی آجاتی تھی کبھی پیار و محبت بلکہ منت و سماجت سے کام لیا جاتا تھا۔ تو کبھی تنگ ہو کر درشتی و سختی اور ناراضگی و تشدّد بھی برتا جاتا تھا۔ غرض چند روز متواتر یہی سلسلہ خاص اہتمام اور تسلسل سے جاری رہا اور جب انہوں نے دیکھا۔ کہ کامیابی کی کوئی راہ باقی نہیں۔ اور اُن کے سارے حیلے ختم ہو چکے ہیں۔ تو مایوس ہو کر اپنے آخری اور اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے جس کا اجمال اور خلاصہ یہ ہے۔ کہ ایک روز علی الصّباح جبکہ میں حسب معمول تلاوت کے لئے قرآن شریف لینے کو اس کمرہ میں گیا۔ جہاں میں نے اُن کو الگ اور ممتاز جگہ رکھا ہوُا تھا۔ تو میں نے اُن کو وہاں نہ پایا۔ میرا قرآن شریف وہاں تھا نہ دوسری کتب میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے شروع کئے۔ اور تلاش کرنے لگا۔ مگر کہیں کچھ نہ ملا۔ آخر بہت سا سامان نیچے اوپر کر دینے کے بعد بعض لحافوں کے نیچے قرآن شریف کے بعض ٹکڑے ملے۔ جس سے میں نے اندازہ کر لیا۔ کہ کسی نے یہ ظلم کیا ہے۔ کہ قرآن شریف اور دوسری کتب کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ چنانچہ مجھے اور زیادہ جستجو ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں مجھے بعض ایسے آثار ملے کہ سنگدلی اور قساوت کا مظاہرہ ان مقدس کتب کو جلا دینے کے رنگ میں بھی کیا گیا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا اور کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ گو میں نے اس ظلم اور انتہائی تشدد کے خلاف زبان سے کچھ نہ کہا۔ مگر میرے سینہ میں رنج و درد اور حقارت و نفرت کے جذبات سے ایسی ایک قسم کی تلاطم پیدا ہو کر بھر گئی۔ کہ اگر میں صبر و ضبط سے کام نہ لیتا۔ تو وہ گھر بھر کو جلا کر راکھ کر دیتی۔ یا ایسا ظلم و ستم کرنے والوں اور اُن کے حامیوں کے پرخچے اڑا دیتی۔ مجھے اتنا غضب چڑھا جس سے میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میرے دل میں اس شدت سے درد اٹھا۔ کہ میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ دل میں جوش اٹھا۔ کہ گھر کو آگ لگا دوں۔ کہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ یا کدال لے کر گرا دوں۔ کہ اس کا نام ونشان مٹ جائے۔ اور وہ زمین کے برابر ہو جائے۔ مگر اس وقت گھر میں صرف ایک بے زبان عورت اور میری ہمشیرہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ جو دونوں میری اس کیفیت سے خوفزدہ اور ہراساں تھیں اور ممکن کہ اُن کو اس معاملہ کا علم بھی نہ ہو۔ ہمشیرہ عزیزہ سے مجھے بے انتہا محبت تھی۔ اور اس بے زبان عورت پر ایک قسم کا رحم آتا تھا۔ جس سے میں بالکل بے بسی کی حالت میں خونِ جگر پی کر رہ گیا۔ اور بجائے کسی پر برسنے کے کمرہ میں بند ہو کر اپنے ہی اوپر برسا اور رو رو کر دل کی بھڑاس نکال لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

یہ ظلم کرنے والوں نے تو اپنے خیال میں میرے ایمان کی عمارت ہی کو مسمار کر دیا۔ اور میری توجہات کے مرکزی قلعہ کو گرا کر مجھے بے سرو سامان کر دیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کے اس ظلم سے میرے اندر نور ایمان کی شعاعیں اور زیادہ تیز ہو کر چمکنے لگیں۔ اور محبت و عشق اور صدق و وفا کے جذبات زیادہ مضبوطی اور تیزی سے میرے دل میں شعلہ زن ہونے لگے۔ اور والدین کے اس فعل کے خلاف میرے دل میں کبھی نہ مٹنے والے جذبات حقارت و نفرت پیدا ہو گئے۔ اور پھر یوں ہوُا کہ جوں جوں انہوں نے مجھے دبانے اور مٹانے کی کوشش کی توں توں اللہ کریم نے مجھے اٹھنے اور ابھرنے کی توفیق بخشی اور اسی طرح شب و روز گزرنے لگے۔ کہ وہ اپنے کام میں تیز ہوتے گئے۔ اور انتہائی مظالم تک کا مجھے نشانہ بناتے رہے۔ قید و بند سے گذر کر انتہائی تشدد کیا جاتا رہا۔ اور اکثر ایسا ہوُا۔ کہ جان تک لے لینے کی کوشش کی گئی۔ مگر اللہ کریم کی باریک در باریک مصلحتوں کے ماتحت آخر کوئی نہ کوئی راہ میری سلامتی اور جانبری کی پیدا ہو ہی جایا کرتی رہی۔ جس سے متاثر ہو کر گاہ بگاہ والدین کے مونہہ سے نکل ہی جایا کرتا تھا۔ "پرمیشور جانے یہ کیسا ہی سخت جان واقعہ ہوُا ہے۔ کہ مارے مرتا ہے۔ نہ کاٹے کٹتا ہے۔"

یہ وہ رنج و غم اور درد و کرب کا زمانہ تھا۔ کہ اس کی یاد آج بھی مجھ پر کپکپی سی پیدا کر دیتی ہے اور میں اس کو بھلا دینے کیلئے آنکھیں بند کر لیا کرتا ہوں۔ اسی زمانہ میں مجھے فرائض کی ادائیگی تک سے محروم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور مجھ پر بھاری پہرہ اور کڑی نگرانی مقرر تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ کہ بعض اوقات کئی کئی نمازیں ملا کر پڑھتا تھا۔ اور اکثر ایسا بھی ہو جاتا تھا۔ کہ اشاروں ہی میں فریضہ نماز

ادا کرنا پڑتا تھا۔ اسی جور و ستم کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ کہ ایک روز علی الصبح میں گھر سے باہر قضاء حاجت کے بہانے سے گیا۔ گیہوں کے کھیتوں کے اندر وضو کر کے نماز پڑھ رہا تھا۔ کہ ایک شخص کدال لئے میرے سر پر کھڑا رہا۔ نماز کے اندر تو یہی خیال تھا کہ کوئی دشمن ہے۔ جو جان لینے کیلئے آیا ہے۔ لہٰذا میں نے نماز کو معمول سے زیادہ لمبا کر دیا۔ اور آخری نماز سمجھ کر دعاؤں میں لگا رہا۔ مگر سلام پھیرنے کے بعد معلوم ہوُا۔ کہ وہ ایک مسلمان مزدور تھا کشمیری قوم کا۔ جو مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر بہت خوش ہوُا۔ اور جب میں نماز سے فارغ ہوُا۔ تو نہایت محبت اور خوشی کے جوش میں مجھ سے پوچھا۔

"منشی جی! کیا یہ سچی بات ہے۔ کہ آپ مسلمان ہیں؟"

اثبات میں جواب پا کر میں نے دیکھا۔ کہ وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے گو بہت احتیاط کی تھی۔ اور نماز شروع کرنے سے قبل ادھر اُدھر دیکھ لیا تھا۔ کہ کوئی دیکھنے والا تو نہیں۔ مگر وہ شخص میری نظروں سے اوجھل ہی رہ گیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی باریک در باریک مصلحت کے ماتحت ہی ایسا ہوُا تھا۔ جب اس شخص نے مجھ سے میرے اسلام کا سوال کیا۔ تو میں نے جواب کے ساتھ اس کو یہ بھی کہہ دیا۔ کہ ہاں میں اللہ تعالےٰ کے فضل سے اسلام پر قائم ہوں۔ اور اللہ تعالےٰ نے تمہیں میرے لئے گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ کہ کم از کم تم میرے اسلام کے شاہد رہو گے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تم نے مجھے عین حالت نماز میں دیکھا۔ ورنہ میں نے پوری احتیاط کر لی تھی۔ کہ کوئی مجھے دیکھنے نہ پائے۔

اسی تیرہ و تار اور پُر ظلم و ظلمات کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ جب مجھے قادیان سے آئے ہوئے عرصہ ہو گیا۔ اور میری طرف سے کوئی خبر خیریت کی اطلاع دارالامان میں نہ پہنچی تو میرے محسنوں اور بزرگوں، دوستوں اور بھائیوں کے دل میں تشویش، بے چینی و بیقراری پیدا ہوئی۔ اور میری خبر گیری و امداد کا جوش اٹھا۔ اس مقدس بستی کے رہنے والوں کے دلوں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوُا جس کے نتیجہ میں علاوہ دعاؤں کے جو ان بزرگوں نے میری مشکلات کے زمانہ میں میرے لئے کیں ایک نیک دل اور پاک نفس انسان کو (جنکا نام نامی مولوی خدا بخش جالندہری تھا۔ درمیانہ قد، سیاہ فام عمر رسیدہ بزرگ جو اس زمانہ میں ہی حنا کیا کرتے تھے) دریافت حال کی غرض سے میرے پیچھے بھیجا گیا۔ وہ بزرگ اپنے اندر تبلیغ اسلام کا ایک جوش رکھتے تھے۔ اور عموماً سیاحانہ زندگی کے عادی واعظ تھے اور مجھے خیال ہے۔ کہ ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب جالندہری (جو آجکل ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب بی۔ اے کے نام سے مشہور ہیں) کے اسلام لانے میں بھی ان کی مساعی کا کچھ نہ کچھ دخل تھا۔ وہ بزرگ دیہہ بدیہہ اور قریہ بقریہ پھرتے ہوئے طویل اور سخت سفروں کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے ایک لمبے عرصے کے بعد مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور بشکل میرے متعلق صرف اتنی

خبر پا سکے کہ عبدالرحمٰن زندہ ہے۔ مسلمان ہے اور کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے عبدالرحمٰن کو زندہ دیکھا۔ اور اسلام کی تصدیق کرائی ہے۔ بس

ایک روز صبح کے وقت جبکہ سورج کچھ بلند ہو چکا تھا۔ والد صاحب گشت یا گرداوری کی غرض سے باہر تشریف لے جا چکے تھے۔ گھر کی مستورات اور میرے بھائی گھر میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، اچانک میرے دل میں کچھ گدگدی سی ہوئی۔ اور از خود زندگی پیدا ہو کر ایک اُبال اٹھا۔ جس سے بیقرار ہو کر میں کمرہ سے نکل صحن میں ٹہلنے لگا۔ اِدھر اُدھر دو چار ہی چکر لگائے ہونگے۔ کہ "منشی جی" کی ایک دھیمی اور لرزتی ہوئی آواز کان میں پڑی دل کسی تحریک غیبی کے ماتحت پہلے ہی سے گوش ہوش بنا ہوُا تھا۔ اُدھر آواز میں ایک قسم کا تعارف اور شناسائی سی محسوس ہوئی۔ جھٹ دروازہ کھولکر باہر جا کھڑا ہوُا۔ جدھر سے آواز آئی تھی۔ آنکھیں اُدھر کو گاڑ دیں۔ مگر سامنے کوئی نظر نہ آیا۔ آخر چند قدم حرکت کر کے آگے بڑھا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہی بزرگ مولوی خدا بخش نامی جو ایک پیلو کے جھاڑ کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ سامنے ہو کر السلام علیکم بولے میں نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ کے الفاظ میں جواب دیا۔ مگر آواز کے سنبھالنے کی بھی ساتھ ہی فکر رکھی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے دُور ہی دُور کھڑے خیریت پوچھکر اسلام کا سوال کیا۔ جس کا میں نے بھی اشاروں ہی اشاروں میں جواب دیا۔ اور وہ مطمئن ہو کر جلدی جلدی آگے نکل گئے۔ ٹھہرنا انہوں نے ہی مناسب سمجھا۔ نہ میں نے اُن کو زیادہ روکنا مناسب سمجھا۔ اور اسی دیدۂ دُور کو غنیمت جانتے ہوئے آن کی آن میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اور بات ایسی معلوم دینے لگی جیسے کسی نے خواب دیکھا ہو مولوی صاحب محترم اپنی جگہ خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے اور جو کچھ انہوں نے کیا۔ اُس سے زیادہ کوئی کر بھی نہ سکتا تھا۔ اور میں اپنی جگہ احتیاط اور اخفاء راز کے خیال سے جتنا موقعہ ملا اور جو کچھ ہو سکا اس کو کافی سمجھ کر صبر کر بیٹھا۔ مولوی صاحب مکرم پھرتے پھراتے پوچھتے پچھاتے ہمارے ہیڈ کوارٹر سے تین چار میل کے فاصلے ایک اعوان قوم کی مسلمان بستی میں شب باش ہوئے تھے۔ جہاں سے ضروری حالات کا علم لینے اور احتیاطی تدابیر کے ساتھ کام کرنے کی ہدایات لے کر وہ علی الصبح اٹھے اور ہمارے ہاں پہنچے تھے۔ اور دور ہی دور سے ایک دوسرے کی خبر لینے دینے کا کام ہو سکا تھا۔ مولوی صاحب گاؤں کیطرف بڑھے مگر راستہ چھوڑ کر باہر ہی باہر ہو کر کھیتوں میں سے نکل گئے۔ جب تک وہ نظر آتے رہے۔ میں کھڑا اُن کی پیٹھ دیکھا کیا۔ اُن کے آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد کچھ سوچ اور فکر کے بعد میں گھر کے اندر چلا گیا۔ اور چونکہ مجھ پر اس وقت ایک خاص حالت طاری تھی۔ سب سے جدا ہو کر لیٹ گیا۔ اور کسی گہری سوچ

میں پڑ گیا۔ ابھی میں اسی سوچ ہی میں تھا۔ کہ والد صاحب قبلہ باہر سے جلد جلد آئے اور میرے متعلق دریافت فرمایا۔ کہ کہاں ہے؟ اور پھر میرے پاس تشریف لا کر پوچھا۔ "آج کون مولوی آیا تھا۔ اور وہ کیا کہتا تھا۔ اب وہ کدھر کو گیا ہے؟" لب و لہجہ سے غم و غصہ عیاں تھا۔ میں بھانپ گیا۔ کہ مولوی صاحب کی آمد کی اطلاع والد صاحب کو ہو گئی ہے۔ مگر میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے عرض کیا۔ "کون مولوی صاحب آپ کی مراد ہیں۔ میں نہیں جانتا کدھر سے آئے اور کدھر کو گئے؟" والد صاحب پھر جلدی جلدی باہر چلے گئے۔ اور مجھے اب یہ فکر دامنگیر ہوئی۔ کہ مبادا مولوی صاحب پکڑے گئے ہوں۔ اور اگر ایسا ہوُا۔ تو مشکلات کا ایک اور نیا باب میرے واسطے کھل جائیگا۔ اور میرے خیالات کی رَو کا رُخ اب کسی دوسری جانب پھر گیا۔ اور میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا۔ کہ والد صاحب کے تشریف لانے کی آہٹ آئی۔ میں ہوشیار ہوُا۔ اور کسی خبر کے لئے ہمہ تن گوش ہوُا۔ والدہ صاحبہ کے دریافت فرمانے پر والد صاحب نے سارا قصہ کہہ سنایا کہ مجھے کسی نے خبر دی تھی۔ کہ ٹھوار خانہ کی طرف سے ایک اس رنگ و شکل کا مولوی گاؤں کی طرف بڑھتا دیکھا گیا تھا۔ مگر وہ بجائے گاؤں میں سے ہو کر جانے کے باہر باہر نکل گیا ہے۔ جس سے شبہ ہوُا۔ کہ کوئی قادیان کا مولوی آیا ہوگا۔ آدمی تلاش میں دوڑائے مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ ورنہ اس کو پتہ لگ جاتا۔ کہ ہمارے گاؤں میں کسی مُسلے کے آنے کا کیا مطلب؟ خوش نصیب تھا بچکر نکل گیا۔ اچھا ہے۔ ہمیں زیادہ ہوشیار کر گیا ہے۔

یہ سنکر میری بھی جان میں جان آئی۔ اور اندر ہی اندر میں نے اللہ تعالےٰ کا شکرانہ ادا کیا۔ ورنہ میرے واسطے سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ اگر خدانخواستہ مولوی صاحب پکڑے جاتے اور اُن کے قادیان سے آنے کا علم ہو جاتا۔ تو اُن لوگوں نے ضرور اُن کی توہین کرنی تھی جس کو میں قطعاً برداشت نہ کر سکتا۔ اور اسطرح نامعلوم کیا نتائج نکلتے اور کیا کیا تکلیف دہ حالات پیدا ہو جاتے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ میں والد صاحب کا بہت ہی احترام کرتا تھا۔ اور اسی احترام کے باعث میں گو نہ حد سے زیادہ دبا ہوُا بھی تھا۔ اور اُن کے مونہہ چڑھنا یا اُن کا مقابلہ کرنا میرے واسطے ناممکن تھا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں۔ کہ کسی فعلی توہین اور علی الاعلان تذلیل کو میں کبھی برداشت نہ کر سکتا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی ستاری تھی۔ کہ ایسا موقعہ ہی پیدا نہ ہونے دیا۔ ع۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت والی بات بن گئی۔ مولوی صاحب موصوف کی یہ ملاقات خواہ وہ کتنی ہی دُور سے ہوئی۔ میرے لئے بڑی قوت و سکون اور تازگی کا باعث ہو گئی۔ اور قادیان سے دور ہونے کی وجہ سے اگر کچھ زنگ طبیعت پر لگا بھی تھا۔ تو اس ملاقات نے صیقل کا کام دیا۔ اور میرے دل میں اس مقدس بستی اور اس کے رہنے والوں خصوصاً اس کی رُوح رواں

کی ذات والاصفات سے وابستگی کا تعلق اور نیاز مندی کے جذبات زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو گئے۔ مولوی صاحب کا آنا گویا ایک قسم کی روحانی غذا تھی۔ جو اللہ کریم نے میرے لئے غیر متوقع طور سے اُس بیابان میں مہیا فرمادی۔

میرے والدین کے دل کو لگی ہوئی تھی۔ وہ دن رات اسی فکر میں غلطان رہتے تھے۔ کہ کسی طرح سے میرے دل سے درخت ایمان کو کھود باہر پھینکیں۔ اور قادیان والوں کی یاد میرے دل سے محو کر دیں۔ جس کے لئے وہ نت نئے سامان اور ارادہ سے گھڑتے ہؤا کرتے تھے اور ایک ہتھیار کو غیر مؤثر اور بیکار پاکر دوسرے کا استعمال شروع کر دیتے تھے۔ اب انہوں نے بہت سی سوچ بچار کے بعد مجھے اپنے کام میں معاون بنا کر بے حد مصروف کر کے میری توجہات کو دوسری طرف لگا دینے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنی کمزوری۔ ہم وغم اور کثرتِ کار کے تذکرے میرے کانوں میں ڈال کر مجھے فرمایا۔ کہ میں اُن کے ساتھ کام میں مدد دیا کروں چنانچہ میں والد صاحب کے ساتھ گشت پر جانے لگا۔

گرداوری اور پیمائش کے علاوہ اصول وارہ بندی اور زمیندار و حکّام سے میل ملاقات کے فرائض کی انجام دہی میں لگا رہا اور تھوڑے ہی دن کے بعد والد صاحب کو میں نے قریبًا فارغ کر دیا۔ تنہا کام چلانے کے قابل ہو گیا اور چونکہ اس میں مجھے گونہ آزادی حاصل تھی۔ میں اپنے دینی فرائض کی تکمیل کے واسطے کافی موقعہ پاتا تھا۔ میں نے اس کام میں زیادہ ہوشیاری و محنت اور انہماک و شغف کا ثبوت دیا جس سے والد صاحب بہت خوش اور متأثر ہوئے۔ اور میری قابلیت و واقفیت کا خود امتحان کرنے کے لئے اپنے ایگزیکٹو انجنیئر بہادر کے روبرو پیش کر کے میرا امتحان دلا دیا جس میں مَیں کامیاب نکلا۔

کام میں پڑ جانے اور اس کے ذریعہ سے اصل مقصد کے حصول میں آزادی و سہولت میسر آ جانے سے میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ اور میں اس ذوق سے کام کرنے لگا۔ کہ اس میں رات دن اور گرمی سردی کا احساس بھی مجھے نہ رہتا۔ اور جب کام سے واپس گھر پہنچتا۔ والدین اور بھائی بہن مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور آنکھوں پر بٹھاتے اور خلاف معمول میری خاطر مدارات بلکہ عزت و احترام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اور عجب نہ تھا۔ کہ شیطان اسی راہ سے کامیابی کا منہ دیکھ پاتا۔ اور ہوتے ہوتے اصل مقصد و مدعا میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ کیونکہ اس طرح مجھ پر دنیاداری کا ایک رنگ چڑھنے لگا تھا۔ تعریف و توصیف کی وجہ سے میرے خیالات کسی اور طرف کو بہنے لگے۔ اور اگرچہ میں نے زیادہ دلچسپی و انہماک اس کام میں ابتداءً محض فرائض دینی کی ادائیگی میں آزادی و سہولیت کے باعث دیا تھا۔ مگر اس میں بھی شبہ نہیں۔ کہ شیطان ایسے باریک در باریک رنگ اور نہاں در نہاں راہوں سے آرہا تھا۔ کہ اگر چندے اور یہی حالات رہتے۔ اور اللہ کریم غیب سے ہمیشہ کی طرح میری دستگیری و راہ نمائی کے سامان نہ فرماتے۔ تو میں اس زہر آلود انگبیں کو شیریں و شفا بخش ہی یقین کرتے ہوئے نوش کر جاتا اور ہمیشہ کیلئے روحانی موت کی نیند سو جاتا۔ قریب تھا۔ کہ والد صاحب کی مساعی مجھے کوئی علیحدہ حلقہ دلا کر مستقل ملازمت دلانے میں کامیاب ہو جاتیں۔ کیونکہ میرے کام میں لگ جانے سے وہ بالکل فارغ اور مطمئن ہو کر افسران متعلقہ تک پہنچکر کوشش کرنے کیلئے فرصت پاتے تھے۔ اور میرے کام کی عمدگی اور شہرت کا چرچا دوسرے ذرائع سے بھی حکام بالا کے کانوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس لئے اُن کی طرف سے والد صاحب کو ایسی امیدیں بھی دلائی جا چکی تھیں۔ مگر قربان جاؤں اپنے مولا کریم کے جس نے بچپنے ہی سے خود اپنی رحمت کے ہاتھوں میرے دل میں تخم ایمان بویا۔ خود ہی اُسے پودا بنا کر ہمیشہ اس کی آبیاری فرمائی۔ اور ہر باد صرصر کے تھپیڑوں سے اپنا دست رحمت دیکر محفوظ رکھا۔ اور آج بھی اس نے اس سیل ضلالت سے اپنی قدرت نمائی کے ذریعہ بچا کر نجات دی۔ اور یوں ہؤا۔ کہ اچانک حکّام بالادست کی طرف سے والد صاحب کے تبادلہ کے احکام پہنچے اور دوسرے حلقہ میں پہنچکر چارج لینے کے لئے اتنا تھوڑا وقت دیا گیا۔ کہ کسی قسم کی کوشش کا موقعہ ہی نہ تھا۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات والی بات۔ سرکاری ملازمت چون و چرا کی گنجائش نہ تھی۔ ناچار بادل ناخواستہ سفر کی تیاری کرنی پڑی۔ منزل دور تھی۔ اور سامان زیادہ۔ اس کے باندھتے بندھاتے ہی ایک دو روز لگ گئے۔

بیل گاڑیوں کا انتظام اور سواری کا سامان کر کے والد صاحب تو ایک تیز رو سواری لے کر نئے حلقہ کو روانہ ہو گئے۔ تاکہ وقت پر پہنچکر چارج لے سکیں۔ پیچھے انتظام میرے ایک عم زاد مجھ سے بڑے بھائی کے سپرد تھا۔ جو کچھ عرصہ سے کام سیکھنے کو میرے والد صاحب کے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ سخت متعصب اور کٹر ہندو ہونے کے علاوہ چونکہ شریک بھائی بھی تھے۔ لہٰذا ان کی میری اکثر چلتی ہی رہتی تھی۔ اور وہ عمومًا اپنے تعصب کے باعث میرے لئے بھاری روک اور بڑی تکلیف کا موجب بنتے رہتے تھے اس سفر میں والد صاحب کی عدم موجودگی کے باعث ان کی وجہ سے مجھے بہت زیادہ تکالیف کا سامنا رہا۔ بات بات پر جھگڑا۔ بات بات پر اعتراض۔ میں کبھی مونہہ ہاتھ دھونے بیٹھوں تو جھٹ شکائت کہ "دیکھو مسلمانی اس کے اندر سے نہیں نکلی۔ مسلمانوں کی طرح دونوں ہاتھ سے مونہہ دھوتا ہے۔ یہی نہیں تین تین بار دھوتا ہے۔ مسلمان بھی ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ دیکھو تو کھانے سے پہلے مونہہ میں گنگنا کر بسم اللہ پڑھتا ہے۔ اور اگر بسم اللہ نہیں پڑھتا۔ تو جو کچھ پڑھتا ہے اونچا پڑھے۔ تاکہ ہمارا شبہ نکل جائے۔ جنگل جانے کا تو بہانہ ہوتا ہے۔ وہ تو پیچھے رہ کر نماز پڑھتا ہے۔ بھلا جنگل جانے میں بھی اتنی دیر لگا کرتی ہے۔ اور وہ اتنی دور کیوں نکل جاتا ہے۔ کہ کوئی دیکھ نہ سکے۔"

غرض تین رات اور دو دن کا سفر قریبًا ایسی ہی مشکلات میں کٹا۔ والدہ کو ایسی باتوں سے تکلیف ہوتی اور دوسروں کو بھی۔ اور اسطرح جھگڑا شروع ہو جاتا۔ زنانہ ساتھ تھا۔ بیل گاڑیوں کا سفر، راستہ بھی خراب تھا۔ اور اکثر جگہ نہر کے پانی کی وجہ سے بہت ہی تکلیف دہ حالات پیش آتے رہے راستہ میں کئی مرتبہ ان کی میری دو بدو ہاتھا پائی اور لاٹھی سوٹے تک بھی نوبت پہنچی۔ آخر خدا خدا کر کے نئے حلقہ کے حدود آئے جہاں والد صاحب خود معہ چند کسانوں کے موجود تھے۔ دور سے والد صاحب اور ان کے ساتھ مسلمان کسانوں کو دیکھ کر میرے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور راستہ کی کوفت اور ناخوشگوار حالات بھول گئے۔ ہم لوگ رات کے اندھیرے میں ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ جو موضع لدھڑ میں تھا۔ اور لدھڑ دیاں۔ بہلول پور کے علاوہ دو ایک اور گاؤں اس حلقہ میں شامل تھے۔ جو سارے کے سارے ہی پہلے حلقہ کے برخلاف کلیتہً مسلمان زمیندار اور مزارعان کے تھے یہ علاقہ سانگلاہل ریلوے اسٹیشن سے ملحق بلکہ ایک ریلوے سٹیشن سالاروالا نام خود اس حلقہ کے اندر واقعہ تھا۔

نیا حلقہ نئے لوگ اور نئے ہی حالات اوّل اوّل تو کچھ عرصہ اجنبیّت ہی میں گزرا۔ مگر جب تعارف ہؤا۔ تب بھی جو خیال دل میں مسلمان شکلوں کو دیکھنے سے پیدا ہوتا تھا۔ غلط نکلا۔ لوگ واقعی مسلمان کہلاتے تھے۔ نام بھی اُن کے مسلمانوں کے سے تھے۔ بڑے بڑے قدآور لمبے چوڑے اور شکیل جوان تھے۔ اچھے اچھے خوبصورت اور سجے سجائے چوڑے حقے ہر وقت اُن کے رفیق اور اُن کی مجالس کی رونق بنتے تھے۔ لدھڑ خاص میں ایک مسجد تھی۔ ملّاں بھی مقرر تھے۔ مگر جتنا عرصہ میں وہاں رہا میں نے اُن لوگوں میں مندرجہ بالا علامات کے سوا اور کوئی علامت اسلام کی دیکھی نہ اتنے عرصہ میں کبھی اذان کی آواز ہی میرے کان میں پڑی۔ وہ لوگ مسلمان کہلاتے تھے۔ مگر افسوس کہ اُن کے اعمال مومنانہ نہ تھے۔ بلکہ وہ خادم اسلام کہلانے کی بجائے اسلام فروش کہلانے کے مستحق تھے۔ اور جیسا کہ میں آگے چل کر اپنے موقعہ پر بیان کرونگا۔ میرے بعض بزرگوں کے ساتھ ملکر مسلمان کہلاتے ہوئے مجھے مسلمان یقین کرتے ہوئے پکڑ کر دشمنانِ اسلام کے حوالے کرنے کی غرض سے قادیان تک بھی پہنچے تھے مگر اللہ کریم نے اس موقعہ پر بھی اپنے خاص ہی فضل سے مجھے ان ظالموں کے پنجے سے نجات دیکر محفوظ رکھا۔ اور ان کو ناکام و نامراد اور نادم و شرمندہ ہو کر خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔ ان لوگوں نے نہائت ہی ادنیٰ دنیوی خیالی فائدہ کی خاطر جو ایک پٹواری نہر کی مہربانی سے ان کو پہنچنے کی توقع تھی۔ ایک مسلمان مرد کو اسلام سے مرتد کرنے تک میں مدد دینے سے دریغ نہ کیا۔ پس مجھے تو اُن کے اسلام کی اس سے زیادہ کوئی خصوصیت یاد نہیں۔

قادیان سے نکلے مجھے کئی ماہ گذر چکے ہیں۔ کوچۂ قادیان میری نظروں میں اور دارالامان کے مقدسین اور اُن کے آقا و ہادی کی پاک شکلیں میرے دل میں ہیں۔

صبح کی سیر اور شام کا دربار میری یاد میں ہے۔ مگر افسوس سبھی خاموش ہیں۔ نہ کوئی محبت بھری سُریلی آواز کان میں پڑتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی مقدس ہستی مجھ سے مخاطب ہو کر مجھے کچھ فرماتی ہے اور یہ خموشی و سکوت کا سماں عالمِ خواب کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے دل ایک تپش اور خلش محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور اس دوری اور ہجر و فرقت کی لمبی گھڑیاں اب بے قرار کئے دیتی ہیں۔ اب یہ جدائی اتنی لمبی اور اتنی بوجھل معلوم دیتی ہے۔ کہ اس کا خیال بھی دل میں درد و کرب پیدا کرنے لگا ہے۔ دل اچھلتا ہے۔ اور روح پرواز کرتی ہے۔ ہو سکے تو اڑ کر قادیان پہنچا چاہتا ہوں۔ مگر بے بس ہوں۔ کوئی یار نہ مددگار۔ وسیلہ ہے نہ ہتھیار، جس کی مدد سے میں ان سنگین و آہنی زنجیروں کو توڑ کر اڑ جاؤں۔ اور اپنے روحانی بسیرے میں جا ڈیرہ ڈالوں انسانوں میں سے کوئی ایک بھی اپنا ہمخیال و ہمنوا نہیں جس سے دل کی کہوں۔ اور مدد کا طلبگار بنوں۔ آجا کے صرف اور صرف ایک ہی ذات ہے۔ جس کی طرف نگاہ اٹھتی اور روح فریاد کیلئے پرواز کرتی ہے۔ جب کبھی موقعہ ملتا اور تنہائی میسر آ جاتی ہے۔ جی کھول کر عرض و معروض کر لیتا ہوں۔ ورنہ دل ہی دل میں گریہ و بکا اور فریاد و التجا کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دلی کیفیات کتنی بھی چھپائی جائیں، ظاہر ہو کر ہی رہتی ہیں۔ اور قلبی حالات کا کچھ نہ کچھ اثر بشرہ پر ضرور ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ والدین ان حالات سے بے خبر نہیں۔ بلکہ میری دلی حالت کو میرے چہرے سے پڑھ لیتے ہیں۔ اور پھر سے میری طرف متوجہ ہو کر مجھے دنیوی کاموں میں ڈالکر میری توجہ کو پھیر دینے کی فکر کرتے ہیں۔ اولاً والدہ محترمہ کے ہمرکاب ایک لمبے اور کٹھن سفر کی صعوبتوں میں ڈالا جاتا ہے جو متواتر ایک عشرہ جاری رہا۔ اور جس کی سختی و شدت کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔ جو والدہ محترمہ کی زبان سے نکلے ہوئے آج بھی میں اسی طرح سن رہا ہوں جس طرح کہ اُن دنوں سنتا تھا۔

"آپے ای مرجان گے جو جیٹھ ہیں گے راہ"

یعنی جیٹھ کے مہینے کا سفر موت کے مونہہ میں جانے کے برابر ہوتا ہے۔ اور اسی مقولہ سے میں اندازہ کیا کرتا ہوں۔ کہ مئی جون ۱۸۹۶ء کا یہ واقعہ ہے۔ اس سفر میں والدہ محترمہ مجھ سے بہت خوش ہوئیں۔ اور میری خدمات، فرمانبرداری جفاکشی اور دلیری کا ان کے دل پر خاص اثر ہوا جس کے نتیجہ میں وہ مجھ پر خاص شفقت کرنے لگیں۔ اور بارہا میری ان خدمات کا ذکر کر کے ایک آہ سرد بھر لیا کرتی تھیں۔ کہ ایسا شیر بچہ کس مرض (عشقِ اسلام) میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یہ سفر سانگلہ سے چونیاں تک آمد و رفت کا تھا۔ جو خطرناک ویرانے جنگلوں کے باعث اور واپسی پر بعض چور اور ڈاکوؤں سے مقابلہ ہو جانے کی وجہ سے واقعی نہائت ہی بھیانک تھا۔ جو محض اللہ تعالٰے کے فضل سے بخیریت سرانجام ہوا۔

مجھے اب قادیان پہنچنے کی جلدی ہے۔ زیادہ صبر کی اب مجھ میں طاقت نہیں۔ دل اداس اور جی گھبرایا ہوا ہے۔ لہٰذا میں واقعات کی تفاصیل کو چھوڑتا ہوا صرف اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ اور بہت ہی مختصر کر کے لکھونگا۔ تاکہ جلد تر پھر مجھے دارالامان پہنچکر اپنے آقا کی قدمبوسی کا شرف مل سکے۔ اور میری روحانی پیاس اور روح کی تڑپ مٹے۔

والد صاحب نے مجھے پھر اسی اپنے کام میں لگا لیا۔ اور میں بھی کرنے لگا۔ والد صاحب کی وہی کوشش اور وہی خواہش تھی۔ کہ جس طرح بھی بن پڑے۔ مجھے ملازمت کے جال میں پھنسا کر جکڑ دیں۔ اتفاق سے سانگلاہل سے اوپر تھوڑے فاصلہ پر بڑی نہر میں ناکہ پڑ گیا۔ چونکہ ناکہ رات کے اندھیرے میں پڑا تھا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اور وہ اتنا بڑھ گیا۔ کہ بیسیوں دیہات سے مدد منگانی پڑی۔ والد صاحب کو بھی اطلاع ملی۔ کہ زیادہ سے زیادہ مدد لے کر فوراً پہنچیں۔ انہوں نے ایک طرف مجھے بھیجا۔ دوسری طرف میرے عمزاد بھائی کو۔ اور خود بھی دوڑ بھاگ کرنے لگے تینوں کی دوڑ دھوپ اور کوشش سے ہماری مدد جہاں جلد تر موقعہ پر جا پہنچی وہاں تعداد میں بھی بہت زیادہ تھی۔ تمام بڑے بڑے افسر موقعہ پر موجود تھے۔ اس چستی سے خوش ہوئے۔ دن بھر نہائت محنت سے کام جاری رہا نہر کا ہیڈ بند کرا دیا گیا۔ اور اوپر کی شاخوں میں پانی زیادہ کر کے پانی کا زور توڑنے کی کوششیں کی گئیں۔ ہزاروں آدمی کام پر تھے۔ دن بھر کی محنت اور شائد ہزاروں ہی بوریوں کے ریت سے بھر کر ناکہ میں ڈال دینے سے یہ امید لگی کہ خطرہ پر قابو پا لیا گیا ہے۔ شام کو جائزہ لیا گیا۔ افسروں کی طرف سے خوشنودی کا اظہار کیا گیا۔ اور اس موقعہ پر میرے والد صاحب پر میری وجہ سے خاص ہی نظر عنائت ہوئی۔ مجھے کام کرتے اور کراتے دیکھ کر انگریز اور دیسی افسران تک نے تعجب کیا۔ اور دریافت کرایا۔ کہ یہ لڑکا کون ہے۔ والد صاحب کی طرف نسبت لازمی تھی شام کو رخصت کرتے وقت افسرِ اعلیٰ نے دس روپے کا نقد انعام مجھے دیکر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور اسطرح میرے والد صاحب بہت خوش اور کامیاب واپس اپنے حلقہ کو آئے۔

والد صاحب محترم کو پہلے حلقہ سے اچانک اور غیر متوقع تبدیلی کا جہاں دنیوی اور مادی فوائد سے محروم ہو جانے کی وجہ سے رنج و صدمہ تھا کیونکہ وہ حلقہ اس لحاظ سے کئی ایک خصوصیات رکھتا تھا۔ اور وہاں والد صاحب نے ایک گہرا اثر اور بھاری رسوخ بھی پیدا کر لیا تھا۔ وہاں ان کو میرے متعلق جو امیدیں لگی ہوئی تھیں اُن سے محروم ہو جانے کا اور بھی زیادہ افسوس تھا۔ اس تازہ حادثۂ نہری کے نتائج جس رنگ میں رونما ہوئے اس سے اُن کو پھر سے امید کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ اور انہیں اپنا مقصود قریب نظر آنے لگا۔ دس روپے کی رقم تو واقعی اُن کے لئے چنداں قابلِ التفات نہ تھی۔ مگر اُن کا اور میرے نام کا یوں افسروں کے کانوں تک پہنچ جانا اور ہمارے کام کا اُن کی نظروں میں چڑھ کر قابلِ انعام سمجھا جانا۔ اُن کو اپنی کامیابی کا یقین دلانے والا ضرور تھا۔

چنانچہ انہوں نے یہاں بھی ایک مرتبہ ان حالات سے فائدہ اٹھانے اور افسرانِ بالا سے میرے متعلق سفارشات حاصل کرنے کی کوشش کی جس میں اُن کو گونہ کامیابی بھی ہوئی۔ مگر باقاعدہ امتحان پاس کرنے کی شرط ساتھ تھی۔ جس کا والد صاحب کو چنداں خیال نہ تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں اس امتحان کو بآسانی پاس کر لونگا۔ چنانچہ والد صاحب نے مجھے میرے عمزاد بھائی اور دو ایک اور امیدواروں کے ساتھ گجرانوالہ بھیج دیا۔ جہاں ان دنوں ایسے امیدواروں کا باقاعدہ امتحان ہوتا تھا۔ مگر مصلحت الٰہی کہ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے مڈل پاس کرنے کی سند کا مطالبہ ہوا۔ جو میرے پاس نہ تھی۔ کیونکہ میں مڈل کے امتحان میں ناکام ہو چکا تھا۔ اس طرح مجھے اس امتحان میں شمولیت کی اجازت نہ ملی۔ اور میں جوں کا توں واپس آ گیا۔ اور میری اسطرح ناکام واپسی والد صاحب کو طبعاً ناگوار گذری۔

کل کائنات عالم بلکہ اس کا ایک ایک ذرہ میرے خالق و مالک خداوند خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ چاہے جدھر اس کا رُخ پھیر دے۔ آسمانوں اور زمینوں اور ان کے درمیان کی تمام اشیاء وہ جمادات ہیں یا نباتات و حیوانات آسمانوں کی انتہائی بلندیوں پر ہیں یا زمین کی اتھاہ گہرائیوں کے نیچے تمام کی تمام اپنی خواص سمیت اُسی کی مخلوق، اُسی کی مملوک اور اسی کے قبضۂ تصرف میں ہیں جس کی خدمت میں چاہے اُن کو لگا دے۔ اور جس کے لئے چاہے اُن سب کو سربسجود کر دے۔ دنیا کے بلند ترین پہاڑ اس کی جبروت کے سامنے لرزاں اور بے پناہ و اتھاہ متلاطم بحار ذخّار اس کی سطوت کے سامنے پُرسکون اور خاموش۔ ہر قسم کی کثیف و درندہ صفت مخلوق اور زہریلی کائنات اس کے اشارہ و حکم کی پابند ہر قسم کی لطیف مخلوق کیا نوری اور کیا ناری ساری کی ساری اس کے احکام کی تعمیل کے لئے دست بستہ و کمر بند۔ عناصر اربعہ کیا ہوا اور کیا آگ، کیا پانی اور کیا خاک سبھی اس کے حکم کے بندے ہیں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ وہ مخلوق بھی جس کی خاطر یہ سب کچھ پیدا کیا گیا۔ اور یہ سارے سامان جمع کئے گئے اور آسمان تک پر بادشاہت کرنے کی قوتیں اُسے ودیعت کی گئیں سورج چاند اور ستاروں کو اس کے لئے مسخر کر دیا گیا۔ اور فرشتوں تک کو اُسے سجدہ کرنے اور اس کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا۔ وہ اشرف المخلوقات بھی خدا کی عزت و عظمت اس کی کبریائی اور جبروت اس کی قدرت و ہیبت کے سامنے ویسی ہی بے بس و ترساں ہے جیسے ایک ننھی سے کیڑی یا نہائت حقیر سا مچھر۔ وہ کسی حرکت یا سکون کا مالک نہیں اور اپنی مرضی و ارادہ میں خدا کی مرضی و اذن کا ویسا ہی پابند ہے جسطرح کوئی ایک پتہ اپنی حرکات میں یا کوئی ذرّہ اپنے خواص کے اظہار میں۔ انسان باوجود اپنی اتنی خداداد عزت و عظمت اور رتبہ و منزلت کے اپنے دل

سمیت جس کو عرش الٰہی بننے تک کی عزت ملی۔ باوجود اس بزرگی کے کلی طور پر خداوند خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور جدھر وہ چاہے اس کو پھیر دیتا ہے۔ اور جو کام چاہے اُس سے کرا لیتا ہے۔

والدین نے میرے دل کو اسلام سے پھیرنے اور مجھے مرتد بنانے کے لئے جو کچھ کیا۔ وہ اتنا زیادہ تھا۔ کہ اگر انسانی کوشش ہی پر سارے تغیرات کا انحصار ہوتا۔ تو وہ نہ صرف مجھی کو مغلوب کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے۔ بلکہ بہت ممکن تھا۔ کہ مسلمانوں سے بدلہ لینے کی غرض سے مرتدین کی ایک فوج بنا لیتے۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ کہ انسانی مساعی کو باثمر و بارور کرنا اور دلوں کو کسی چیز پر قائم رکھنا یا اس سے پھیر دینا، کسی بات میں اثر پیدا کر کے دلوں کو اس کے قبول کرنے کے لئے تیار کرنا۔ یا اس کو بے اثر بنا کر لوگوں کو اس سے متنفر کر دینا۔ الغرض تاثیر پیدا کرنا یا غیر مؤثر بنانا اللہ تعالےٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہی دلوں کے باریک در باریک اور نہاں در نہاں بھیدوں سے واقف اور معرفت القلوب ہے۔ میرے والدین کی تمام مساعی کو اس نے بے اثر بنا کر مجھے اُن کے بد اثرات سے بچایا۔ اور میرے قلب کو اُسی نے وہ حلاوت ایمان بخشی جس کے بعد ایمان کی دولت سے دور ہو جانے کی نسبت ہزار موت بھی آسان ہو جاتی ہے۔ ان کے سارے سامانوں کو بے کار بنایا۔ تو اسی ذات والاصفات نے ورنہ میں بالکل ایک کمزور بچہ تھا۔ کوئی دلیل تھی میرے پاس نہ برہان۔ جس سے اُن کا مقابلہ کر سکتا۔ صرف اور صرف اُسی غیب در غیب ہستی کا پوشیدہ ہاتھ تھا۔ جس نے ہر نازک ترین مرحلہ پر خود میری حفاظت فرمائی۔ اور دل میں وہ نور ڈالا۔ جو حق و باطل میں تمیز کا موجب بنتا رہا۔ اور ہر موقعہ پر مجھے تسلّی واطمینان اور قوت و ثبات بخشتا رہا۔ میری کوئی ذاتی قابلیت نہ تھی۔ بلکہ سراسر میرے آقا و مالک ہی کا فضل تھا۔ جس نے راہنمائی بھی فرمائی اور ہمیشہ دستگیری بھی کی۔

اے اللہ! ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی فضل فرما۔ اور میرا انجام بھی اپنی رضا پر بخیر فرما۔ آمین۔

والدین کسی خیال میں تھے۔ مگر میرا خدا کسی اور ہی خیال میں تھا۔ اُن کی تدبیریں کچھ چاہتی تھیں۔ مگر خدا کی تدبیر کچھ اور ہی کرنے والی تھی۔ گوجرانوالہ سے خلاف امید میری ناکام واپسی کا والد صاحب پر گہرا اثر ہوا۔ اور وہ ابھی کچھ فیصلہ کرنے نہ پائے تھے۔ کہ گھر کی کسی ضرورت کے ماتحت گھر میں کسی بڑی بوڑھی بھتوم بلکہ اپنی کسی رشتہ دار کی ضرورت لاحق ہوئی۔ گھر میں میرے عمزاد بھائی کے علاوہ میرے ایک دور نزدیک کے رشتہ سے چچا بھی موجود تھے۔ ان کو بھیجکر پھوپھی یا دادی صاحبہ (رشتہ کی دادی نہ کہ حقیقی) کو منگایا جا سکتا تھا۔ مگر قربان جاؤں اپنے آقا پر جو سچ سچ مسبب الاسباب اور معرف القلوب بھی ہے۔ نہ معلوم اُس نے والدین کے دل دل میں کیا ڈالا۔ کہ انہوں نے میرے عمزاد بڑے بھائی اور چچا صاحب کو چھوڑ کر پھوپھی یا دادی کو لانے کا قرعہ میرے نام نکلوا دیا۔ بھائی بہت متعصب تھے۔ انہوں نے روک بھی ڈالی۔ اگرچہ اپنا نام تو پیش نہ کیا۔ چچا صاحب کو بھیجنے کا مشورہ دیا۔ مگر درحقیقت ان کی اپنی خواہش تھی۔ کہ وہ جائیں، وطن بھی اُدھر ہی تھا۔ گھر والوں سے بچھڑے عرصہ گذرا تھا۔ ایک پنتھ دو کاج، ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خیال تھا۔ مگر خدا تعالےٰ نے والدین کے دل کو نہ پھرنے دیا۔ اور انہوں نے میرے ہی جانے کا فیصلہ کر کے مجھے روانگی کا حکم دیدیا۔ ضروری ہدایات اور مناسب سامان دیکر رخصت کیا۔ میں نے سانگلاہل ریلوے اسٹیشن سے سوار ہونا تھا اور چونکہ والدین کے اس فیصلہ کے ساتھ ہی میرے دل نے بھی کچھ فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے ساتھی کو جو گھوڑی لے کر مجھے اسٹیشن تک پہنچانے گیا تھا۔ اسٹیشن سے اِدھر ہی رخصت کر دیا۔ تاکہ اس کو یہ علم ہی نہ ہو سکے۔ کہ میں نے ٹکٹ کہاں کا لیا ہے۔ گاڑی آنے والی تھی۔ ٹکٹ بٹ رہے تھے۔ میں بھی بڑھا۔ اور سیالکوٹ کا ٹکٹ لے کر بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا کہتا ہوا سوار ہو گیا۔

خدا کے فضل سے سیالکوٹ پہنچا مسجد میں گیا حضرت میر حامد شاہ صاحب اور اپنے واقفکاروں دوستوں سے ملکر رات گذاری۔ اور پھر اللہ کے بھروسے پر قادیان دارالامان کا قصد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی طور پر اور خارق عادت رنگ میں غیب سے میری حفاظت وامداد کے سامان کئے۔ اور یوں پھر کم و بیش ۹ ماہ بعد مجھے دارالامان میں سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے قدوم میمنت لزوم میں لا ڈالا۔ الحمد للہ۔ الحمد للہ۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ذالک۔ الحمد للہ الذی ھدٰنا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جولائی ۱۸۹۶ء کا آخر یا اگست ۱۸۹۶ء کا ابتدائی حصّہ ہوگا۔ جب خدا تعالیٰ نے دوبارہ قدرت نمائی سے مجھے زندہ کیا۔ اور محض اپنے فضل سے دارالامان پہنچایا میں اُسی زمانہ سے اس واقعہ کو اپنی نشاۃ ثانیہ یقین کرتا رہا ہوں۔

والدین نے مجھے اپنی خاص ضرورت کے ماتحت اہم ضروری کام کے لئے بھیجا تھا۔ مجھے افسوس ہے اور ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ کہ میں نے ان کو سخت تکلیف پہنچائی جس کی تلافی میرے لئے ممکن نہیں۔ میں اُن سے بھی شرمندہ ہوں۔ اور اپنے پیدا کرنے والے سے بھی نادم ہوں۔ کہ آڑے وقت میں مَیں والدین کے کام نہ آسکا۔ اور ان کو سخت انتظار اور پھر سخت تکلیف میں مبتلا کرنے کا موجب بنا۔ مگر کیا کروں، میرا خدا جو میرے دل کی گہرائیوں سے بھی واقف ہے۔ خوب جانتا ہے۔ کہ میں ایسا کرنے میں معذور تھا۔ نہیں بلکہ حق بجانب تھا۔ میں اگر کسی دنیوی طمع اور مال و زر کی لالچ میں ایسا کرتا یا کسی نفسانی خواہش کی پیروی میں یہ کچھ مجھ سے سرزد ہوا ہوتا تو واقعی مستوجب صد لعنت تھا۔ اور اس صورت میں دنیا جہاں میں میرا کوئی ٹھکانہ ہوتا نہ میں کسی شریف انسان کو یہ مونہہ دکھانے کے قابل رہتا مگر میرا خدا جانتا ہے۔ کہ میں نے جو کچھ کیا یا مجھ سے جو کچھ سرزد ہوا۔ وہ ایسی ایک قسم کی خود رفتگی میں ہوا۔ جس میں میری کوشش کا کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ اس کے لئے سارے ہی سامان خود خدا نے غیب سے مہیّا کئے اور جس نیت و غرض سے میں نے یہ کام کیا۔ اس کے مقابلہ میں اگر ہزار والدین اس کام سے روکنے والے قربان بھی کر دیئے جاتے تو مجھ پر الزام نہ تھا۔ کیونکہ خدا اور اس کے دین کے مقابلہ میں ان جسمانی والدین کی ہستی ہی کیا ہے۔ جو خدا اور اس کے دین سے اولاد کو روک رکھیں۔ مگر باوجود اس ایمان کے میں والدین کی اس تکلیف کا احساس دل میں پاتا رہا ہوں۔ اور اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا ہے میں نے دنیوی رنگ میں اُن سے حسن سلوک اور خدمت کے ذریعہ سے اُن کے دل سے اُن اثرات کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اور میں سعادت و فخر محسوس کرتا ہوں۔ کہ والدین باوجود اتنے بھاری اختلاف اور اتنے سخت صدمہ کے بعد میں مجھ سے خوش ہو کر راضی بقضاء ہو گئے تھے۔ اور اکثر میرے پاس آتے۔ اور مہینوں خوشی خوشی ٹھہرتے رہے ہیں۔

نہ صرف والدین بلکہ دوسرے رشتہ دار بھی ہمشیرگان اور بھائی بہنوئی اور بھتیجے اور بھانجے بھانجیاں آتے اور ملتے ملاتے رہے۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس لحاظ سے بھی میں ان کی طرف سے شرمندہ نہیں۔ اور اپنے خدا سے بھی امیدوار ہوں۔ کہ وہ مجھ سے خوش ہو کر مجھے سُرخروئی نصیب فرمائیں گے۔ آمین اللّٰھم آمین۔

ضروری اعلان

اس لطیف مضمون کا دوسرا حصّہ جو بہت اہم اور نہائت دلچسپ حالات پر مشتمل ہے۔ وہ سیرت نمبر کے بعد انشاء اللہ شائع کر دیا جائیگا

"ایڈیٹر"

وصیتیں

نمبر ۵۰۱۷

منکہ بھاگ بھری زوجہ ملک عطاء اللہ صاحب قوم اعوان عمر ۲۵ سال تاریخ بیعت مارچ ۱۹۳۸ء ساکن دوالمیال ضلع جہلم۔ بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۴/۳/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔ میری اس وقت مندرجہ ذیل جائداد ہے۔

حق مہر بذمہ خاوند	۵۰۰/-
چوڑیاں طلائی	۱۱۰/-
کانٹے طلائی	۹۰/-
	۷۰۰/-

میں اس کل جائداد مالیتی ۷۰۰/- روپے کے ۱/۸ حصہ کی وصیت کرتی ہوں۔ اگر میری وفات کے بعد اس کے علاوہ کوئی اور جائداد ہو۔ تو اس کے بھی ۱/۸ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔ اور اگر میں کوئی رقم یا حصہ جائداد صدر انجمن احمدیہ قادیان میں بعد وصیت داخل کردوں۔ تو ایسی رقم یا جائداد کی قیمت زرِ وصیت سے منہا کردی جائے گی۔

الامتہ:۔ بھاگ بھری بقلم خود۔
گواہ شد۔ عطاء اللہ بقلم خود خاوند موصیہ۔
گواہ شد:۔ محمد امیر عفاء اللہ عنہ بقلم خود
گواہ شد۔ محمد اسلم بی۔اے۔ بقلم خود

نمبر ۵۰۲۹

منکہ مسماۃ اللہ جوائی زوجہ مرزا غلام نبی قوم مغل عمر تقریباً ۴۴ سال تاریخ بیعت ۱۹۱۳ء ساکن ہریاوالہ ضلع گوجرانوالہ بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۱۴ر اپریل ۱۹۳۸ء حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔

اس وقت میری جائداد ایک مشین سلائی کی مالیتی ۷۵ روپے ہے۔ اور رقم حق مہر جو ابھی واجب الادا ہے مبلغ ۳۲ر روپے ہے۔ اس کے علاوہ ایک جوڑی کانٹے طلائی وزنی ۳ ماشہ قیمتی نو روپیہ ہے۔ اس کے دسویں حصہ کی صدر انجمن احمدیہ قادیان کے حق میں وصیت کرتی ہوں۔ اس کے متعلق اگر کوئی رقم میں اپنی زندگی میں صدر انجمن احمدیہ قادیان کو ادا کردونگی۔ تو وہ اس میں سے وضع کردی جائے۔ اور اگر میری وفات پر اس جائداد کے علاوہ کوئی اور جائداد میری ثابت ہو۔ تو اس کے ۱/۱۰ حصہ کی بھی صدر انجمن احمدیہ قادیان مالک ہوگی۔

الامتہ:۔ اللہ جوائی۔
گواہ شد۔ غلام نبی خاوند موصیہ
گواہ شد۔ غلام قادر (شیخ) گوجرانوالہ
گواہ شد:۔ عبدالقادر ملیڈر گوجرانوالہ

نمبر ۵۰۲۵

منکہ حکیم محمد یعقوب طبیب آبادی ولد حافظ محمد ابراہیم صاحب قوم شیخ پیشہ طبابت عمر ۲۳ سال تاریخ بیعت نومبر ۱۹۲۷ء ساکن مہاجر قادیان حال وارد لاہور ڈاکخانہ وطن بلڈنگ ضلع لاہور بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۲۲/۳/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتا ہوں۔

میری جائداد اس وقت کوئی نہیں۔ میرا گذارہ طبابت پر ہے۔ لیکن چونکہ ابھی کام کی ابتداء ہے۔ میں اپنی صحیح ماہوار آمد کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ لیکن جسقدر بھی میری ماہوار آمد ہوگی۔ میں تازیست اپنی ماہوار آمد کا آٹھواں حصہ ادا کرتا رہونگا۔ انشاء اللہ العزیز

میرے مرنے کے وقت جسقدر جائداد ثابت ہو۔ اُس کے آٹھویں حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔

العبد:۔ حکیم محمد یعقوب طبیب احمدی بقلم خود
مسجد احمدیہ لاہور بیرون دہلی دروازہ
گواہ شد:۔ عبدالکریم بقلم خود سیکرٹری مال
گواہ شد:۔ نواب دین سیکرٹری وصایا لاہور

نمبر ۵۰۲۱

منکہ بشیر احمد ولد چوہدری چراغ دین نمبردار قوم ارائیں پیشہ زمیندارہ عمر ۱۹ سال پیدائشی احمدی ساکن گوکھووال چک نمبر ۲۷۶ رکھ برانچ ڈاکخانہ چک نمبر ۲۷۵ گ ب تحصیل و ضلع لائل پور بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۱۸/۴/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتا ہوں۔

میری جائداد کوئی نہیں۔ اس وقت میری ماہوار آمد بشکل وظیفہ عٹ روپے ہے۔ میں تازیست ماہوار آمد کا ۱/۱۰ حصہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتا رہوں گا۔ میرے مرنے کے وقت میری جس قدر جائداد ثابت ہو۔ اس کے ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔ پچھلے چار سال کا وظیفہ یکمشت ۱۲۰ روپے ملا ہے۔ اس کے ۱/۱۰ حصہ کے حساب سے ۱۲ روپے ادا کرتا ہوں۔ باقی جب تک ملتا رہے گا ماہوار ادا کرتا رہوں گا۔

العبد:۔ چوہدری بشیر احمد بقلم خود
گواہ شد:۔ ملک بشیر احمد کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ شاہدرہ ضلع شیخوپورہ
گواہ شد۔ حکیم محمد صدیق سیکرٹری مال شاہدرہ ضلع شیخوپورہ
گواہ شد:۔ چراغ دین والد موصی

"الحکم" کی توسیع اشاعت ہر احمدی کا فرض ہے

کونین کے ذریعہ ملیریا کا مختصر طریقِ علاج

ملیریا کا کونین کے ذریعہ مختصر علاج جو ملیریا کے انسداد کا ایک نیا پہلو ہے۔ محض تجرباتی طور پر معلوم کیا گیا ہے۔ اور کئی سال کے امتحانی تجربات کے بعد اُسے عملی طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ڈچ ایسٹ انڈیز اور یونان کے سرکاری طبّی محکمے عرصہ سے کامیابی کے ساتھ اسے استعمال میں لا رہے ہیں۔

یہ طریق علاج اقتصادی لحاظ سے نہایت مفید ہے۔ خصوصاً ایسے ممالک میں جہاں کاشتکار مزدور بکثرت آباد ہوں۔ چنانچہ پانچ سے سات دن تک روزانہ ۱۵ سے ۲۰ گرین کونین سلفیٹ کی خوراک کے استعمال پر کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ اور مزدور جلد بخار سے صحت یاب ہوتے ہیں۔ اور اس طرح انہیں بیماری میں زیادہ دن ضائع کرنے نہیں پڑتے۔

سماٹرا کے اسٹیٹ ہسپتال جو کئی سالوں سے اس مختصر طریق علاج کو استعمال کر رہے ہیں۔ مذکورہ بالا بیان کی صداقت کے شاہد ہیں۔ پیٹرک (بلغاریہ) کے ملیریا اسٹیشن نے ثابت کیا ہے۔ کہ جن بیماروں کو تین سے چار روز تک پندرہ گرین کی خوراک دی جاتی ہے۔ (بچوں کی خوراک ان کے تناسب عمر کے لحاظ سے ہوگی) وہ دوبارہ جلدی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لیکن گذشتہ طویل علاج میں بیماری کے عود کرنے کے زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں۔ بیماری کے نئے حملے بہت حد تک بیماری کے جراثیم کے دوبارہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہوتے ہیں لیکن عموماً ان حملوں کے متعلق غلطی سے یہ تصوّر کر لیا جاتا ہے۔ کہ بیماری کسی حد تک دور ہونے کے بعد دوبارہ عود کر آتی ہے۔

ریلف کے کولنز نے ان تجربات کا ذکر کرتے ہوئے امریکہ کے اخبار جرنل آف ٹراپیکل میڈیسن (جولائی ۱۹۳۴ء) میں لکھا ہے۔ "یہ ظاہر ہے۔ کہ کونین کے کم سے کم استعمال سے حیرت انگیز طور پر تسلّی بخش نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں"

موجودہ صورت میں لیگ آف نیشنز کے ملیریا کمیشن نے یہ قرار دیا ہے۔ کہ حفظ ماتقدم کے طور پر بخار کے موسم میں ہر روز ۶ گرین کونین استعمال کی جائے۔ اور علاج کے لئے بیماروں کو پانچ سے سات روز تک پندرہ سے بیس گرین تک روزانہ کونین کی ایک خوراک دی جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی علاج نہ کیا جائے لیکن بیماری کے دوبارہ عود کر آنے کی صورت میں پھر یہی طریق علاج استعمال کیا جائے۔ (لیگ آف نیشنز کا ملیریا کمیشن)

وصیتیں

نمبر ۴۹۱۷

منکہ محمد فاضل ولد امام دین قوم مغل جرال پیشہ ملازمت عمر تقریباً ۲۵ برس پیدائشی احمدی ساکن شہر جہلم بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۲۲ ۱۱/۳۷ حسب ذیل وصیت کرتا ہوں۔

میری جائیداد اس وقت کوئی نہیں۔ اس وقت میری ماہوار آمد مبلغ بیس روپے ہے۔ میں تا زیست اپنی ماہوار آمد کا ۱/۱۰ حصہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتا ہوں۔ میرے مرنے کے وقت جسقدر میری جائیداد ثابت ہو۔ اس کے ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی

العبد :- محمد فاضل معرفت سنگر سیونگ مشین ایجنسی کوئٹہ بلوچستان

گواہ شد :- مختار احمد ایاز امیر جماعت احمدیہ کوئٹہ

گواہ شد :- محمد اسحاق عابد سکرٹری جماعت احمدیہ کوئٹہ

گواہ شد :- محمد اسمٰعیل سنگر سیونگ مشین کمپنی کوئٹہ۔

نمبر ۵۰۲۷

منکہ مسماۃ زینب بنت مرزا غلام نبی قوم مغل عمر ۲۰ سال پیدائشی احمدی۔ ساکن حال گوجرانوالہ بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۱۳ ۱/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔

میری اسوقت حسب ذیل جائیداد ہے۔ ایک جوڑی کانٹے طلائی وزنی ۲ ماشہ قیمت نو روپے، ایک سو روپیہ نقد جو میرے والد صاحب نے میرے زیور کیلئے دیا ہوا ہے۔ اس کل مجموعی ۱۰۹ روپے کے ۱/۱۰ حصہ کی میں صدر انجمن احمدیہ قادیان کے حق میں وصیت کرتی ہوں۔ اگر کوئی رقم میں اپنی زندگی میں صدر انجمن احمدیہ کو ادا کرونگی۔ تو وہ اُس میں سے وضع کر دی جائے۔ اور اگر میری وفات پر اس جائیداد کے علاوہ کوئی جائیداد ثابت ہو۔ تو اس کے ۱/۱۰ حصہ کی بھی صدر انجمن احمدیہ قادیان مالک ہوگی۔

العبد :- زینب بقلم خود

گواہ شد :- مرزا غلام نبی والد موصیہ

گواہ شد :- محمد بخش میر امیر جماعت احمدیہ گوجرانوالہ

نمبر ۵۰۳۵

منکہ نظیر بیگم بنت فضل الٰہی سیکرٹری تبلیغ قوم جٹ پیشہ ملازمت عمر تقریباً ۲۴ سال تاریخ بیعت دسمبر ۱۹۳۲ء ساکن سیالکوٹ شہر بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۲۳ ۳/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔ میں اس وقت ۴۱۵ روپے کے ۱/۱۰ حصہ کی وصیت خدا کے فضل سے اور کامل صحت کے ساتھ کرتی ہوں۔ جسکی تفصیل درج ذیل ہے۔

میں اس وقت احمدیہ مڈل گرلز سکول میں معلمہ کا کام کر رہی ہوں۔ اور میری ماہوار آمدنی مبلغ ۲۴ روپے ہے۔ اُن میں سے ۲۰ روپے بطور کمیٹی احمدیہ مڈل گرلز سکول میں ہر ماہ ادا کرتی ہوں۔ جن کی تین اقساط ادا کر چکی ہوں۔ میں اس کے علاوہ کمیٹی دار الشکر قادیان میں بطور کمیٹی ۲۱۰ روپے ادا کئے ہوئے ہیں۔ اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم جو کہ ۱۲۵ روپیہ بذمہ سکول ہے۔ اور ایک جوڑی کانٹے طلائی جنکی قیمت ۲۰ روپے ہے۔ نیز ان کے علاوہ نہ کوئی منقولہ جائیداد ہے اور نہ غیر منقولہ۔ ہاں اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ اگر میرے مرنے کے بعد اس سے زیادہ جائیداد ثابت ہو خواہ وہ نقدی کی صورت میں ہو۔ یا زیور کی صورت میں۔ یا جائیداد کی صورت میں ہو۔ اس کے ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔ اور اس بات کا اقرار کرتی ہوں۔ کہ انشاء اللہ سکول والے کمیٹی ملنے پر اپنی جمع شدہ رقم کا ۱/۱۰ حصہ ادا کرونگی۔ اور کمیٹی ختم ہونے پر اپنی ماہوار آمدنی کا ۱/۱۰ حصہ ادا کیا کرونگی۔ کمیٹی کی میعاد اکتوبر ۱۹۳۸ء ہے۔ اگر اس سے پہلے میری موت واقع ہو جائے تو صدر انجمن احمدیہ قادیان کو حق حاصل ہوگا۔ کہ وہ میرے لواحقین سے ۱/۱۰ حصہ میری رقوم کا وصول کرے۔

العبد :- نظیر بیگم معلمہ گرلز سکول احمدیہ سیالکوٹ

گواہ شد :- فضل الٰہی سیکرٹری تبلیغ

گواہ شد :- سیدہ رفعت صاحبہ معلمہ احمدیہ گرلز سکول

گواہ شد :- سیدہ عصمت ہیڈ مسٹرس احمدیہ گرلز سکول سیالکوٹ

نمبر ۵۰۱۶

منکہ امۃ العزیز بیگم بنت حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب قوم مغل عمر ۱۸ سال پیدائشی احمدی ساکن قادیان بقائمی ہوش وحواس بلا جبر و اکراہ آج بتاریخ ۹ ۲/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔

اس وقت میری جائیداد منقولہ تقریباً سو روپے کا زیور ہے۔ اور جائیداد غیر منقولہ بصورت چھ گھماؤں زرعی اراضی واقع موضع راجپورہ تحصیل وضلع گورداسپور قیمتی اندازاً دو سو روپیہ یا سوا دو سو روپے ہے۔ اور اس کے علاوہ اس وقت میری کوئی جائیداد نہیں۔ البتہ مجھے حضرت والد صاحب محترم کی طرف سے ۔/۱۰ روپے ماہوار بطور جیب خرچ ملتے ہیں۔ سو میں اپنی جائیداد منقولہ کا ۱/۳ اور جائیداد غیر منقولہ کا ۱/۳ حصہ بحق صدر انجمن احمدیہ وصیت کرتی ہوں اور اپنی ماہوار آمد کا بھی ۱/۳ حصہ صدر انجمن احمدیہ کو ادا کرتی رہونگی نیز میری وفات پر جو بھی جائیداد علاوہ جائیداد مندرجہ بالا کے میری ملکیت ثابت ہو۔ اس کے بھی ۱/۳ حصہ کی صدر انجمن احمدیہ مالک ہوگی۔ خواہ جائیداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔

الامۃ :- امۃ العزیز بیگم بقلم خود

گواہ شد :- حضرت مرزا محمود احمد

گواہ شد :- حضرت مرزا بشیر احمد

نمبر ۵۰۳۱

منکہ غلام فاطمہ بیوہ شیخ حسین بخش صاحب مرحوم قوم شیخ افغان ککے زئی۔ عمر ساٹھ سال تاریخ بیعت ۱۹۰۳ء ساکن دھرم کوٹ رندھاوا ڈاکخانہ خاص تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور حال منٹگمری بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۵ ۴/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں

اس وقت میری جائیداد حسب ذیل ہے۔ نصف قطعہ (نصف احاطہ) سفید زمین رقبہ ۱۰ مرلے واقع قصبہ منٹگمری خاص احاطہ نمبر ۲۲ اسلام آباد مالیتی ۱۲ صد روپیہ۔ ایک مکان پختہ (۵۰ × ۶۰ قریباً) واقعہ دھرم کوٹ رندھاوا تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور جسکا حدود اربعہ (شمال میں شارع عام۔ مغرب میں مکان شیخ احسان علی کنسٹیبل۔ مشرق میں مکان شیخ مہر دین اور مغرب میں گلی) ہے۔ علاوہ ازیں میری جائیداد از قسم سامان خانہ مالیتی یکصد روپیہ ہے۔ اور دو عدد بالیاں طلائی ایک تولہ مالیتی قریباً پچاس روپے ہے۔ میں اپنی مذکورہ بالا جائیداد کے ۱/۱۰ حصہ کی وصیت بحق صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتی ہوں۔ اور یہ بھی وصیت کرتی ہوں۔ کہ میری وفات کے وقت جسقدر بھی میری جائیداد ہو۔ اس کے ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔ اگر میں اپنی زندگی میں کوئی رقم یا کوئی جائیداد خزانہ صدر انجمن احمدیہ میں بمد وصیت حوالہ کر کے رسید حاصل کر لوں۔ تو ایسی رقم یا ایسی جائیداد کی قیمت حصہ وصیت کردہ سے منہا کر دی جائیگی۔ میرا گذارہ اس وقت میرے پسران کے ذمہ ہے۔ مگر انہوں نے تا حال میرے حقوق کا تصفیہ نہیں کیا۔ کہ وہ مجھے کس قدر گذارہ ماہوار یا ششماہی نقد یا پیداوار کی صورت میں دینگے۔ اس لئے میں گذارہ کی آمد کا تعین نہیں کر سکتی۔ فیصلہ ہو جانے پر جو گذارہ مجھے پسران کی طرف سے ملیگا۔ اس کا بھی ۱/۱۰ حصہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتی رہونگی۔

العبد :- غلام فاطمہ بقلم خود

گواہ شد :- نصیر احمد پوسٹل کلرک منٹگمری۔

گواہ شد :- شریف احمد بقلم خود کنسٹیبل ۹۱ منٹگمری

گواہ شد :- غلام حسین چاہلوں

نمبر ۵۰۰۷

منکہ جنت بی بی بیوہ چوہدری نظام دین صاحب مرحوم قوم کشمیری عمر ۶۰ سال تاریخ بیعت جنوری ۱۹۳۶ء ساکن پسرور ضلع سیالکوٹ بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۲۸ ۲/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتی ہوں۔

میری اسوقت کوئی جائیداد از قسم غیر منقولہ یا زیور کے نہیں ہے۔ جو کہ مجھے اپنے خاوند سے ملی ہو۔ میرا گزارہ میرے دو لڑکوں محمد دین و محمد صدیق احمدی غیر مبائع کے ذریعہ ہے۔ جو کہ مجھے خرچ دیتے ہیں۔ اس خرچ میں سے جو وہ مجھے دیتے رہے ہیں میں نے تھوڑا تھوڑا جمع کیا ہے۔ جو کہ نقدی کی صورت میں میرے پاس ایک سو دس روپے کی صورت میں ہے۔ میں اس کے ۱/۱۰ حصہ کی وصیت صدر انجمن احمدیہ قادیان کے حق میں کرتی ہوں جسکو میں اپنی زندگی میں ہی صدر انجمن احمدیہ قادیان کے حوالے کر دونگی۔ اور اگر میری فوتگی کے وقت کوئی اور جائیداد ثابت ہو تو اس کے بھی ۱/۱۰ حصہ کی وصیت بحق صدر انجمن احمدیہ کرتی ہوں

العبد :- نشان انگوٹھا۔ جنت بی بی بیوہ چوہدری نظام الدین مرحوم خاص پسرور۔

گواہ شد :- فضل احمد محرر لوکل فنڈ پسرور

گواہ شد :- مولوی محمد عبداللہ احمدی مولوی فاضل گورنمنٹ سکول پسرور۔

نمبر ۵۰۳۳

منکہ عبدالرحمٰن خان مولوی فاضل ولد مولوی معین الدین صاحب قوم افغان پیشہ ملازمت عمر ۲۶ سال پیدائشی احمدی ساکن قادیان بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ یکم اپریل ۱۹۳۸ء حسب ذیل وصیت کرتا ہوں

میری اسوقت کوئی جائیداد نہیں۔ البتہ مجھے دفتر الفضل سے بطور الاؤنس ۲۵ روپے ماہوار ملتے ہیں۔ میں اس کا دسواں حصہ ہر ماہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتا رہونگا۔ نیز میرے مرنے پر جو میری جائیداد ثابت ہو۔ اس کے بھی ۱/۱۰ حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔

العبد :- عبدالرحمٰن مولوی فاضل رکن ادارہ الفضل

گواہ شد :- محمد یعقوب اسسٹنٹ ایڈیٹر الفضل

گواہ شد :- سید احمد مولوی فاضل

نمبر ۵۰۲۳

منکہ عبدالعزیز مغل ولد میاں چراغ دین صاحب قوم چغتائی عمر باسٹھ سال تاریخ بیعت ۱۸۸۹ء ساکن احمدیہ مبارک منزل ڈاکخانہ وطن بلڈنگ لاہور ضلع لاہور بقائمی ہوش وحواس بلاجبر واکراہ آج بتاریخ ۲۲ ۳/۳۸ حسب ذیل وصیت کرتا ہوں۔

میری جائیداد اس وقت کوئی نہیں۔ میری ماہوار آمد تخمیناً پچیس روپیہ ہے۔ میں تا زیست اپنی ماہوار آمد کا دسواں حصہ داخل خزانہ صدر انجمن احمدیہ قادیان کرتا رہونگا۔ میرے مرنے کے وقت میری جسقدر جائیداد ثابت ہو۔ اس کے بھی دسویں حصہ کی مالک صدر انجمن احمدیہ قادیان ہوگی۔

العبد : عبدالعزیز مغل

گواہ شد :- نواب دین سکرٹری وصایا لاہور

گواہ شد :- عبدالکریم سیکرٹری مال لاہور۔